سے کسی کی تنقید یا توثیق ہو تو اس کو درج کرتے ہیں، اور پھر اس کے موافق یا مخالف حدیث کی روایتیں ہوں تو اس کو لکھتے ہیں، پھر رجال واسناد کی امداد سے کسی روایت کو راجح کسی کو مرجوح قرار دیتے ہیں، شرّاحِ حدیث بھی یہ ہی کرتے ہیں، اور فی الواقع دونوں کا کام ایک ہی ہوتا ہے، صرف ترتیب کا فرق ہوتا ہے، حدیث کی کتابیں فقہی ابواب پر تقسیم ہوتی ہیں، اور سیرت کی کتابوں کی سنین پر واقعات کی ترتیب ہوتی ہے۔ (۳۸)

اس بیان کے پیشِ نظر کسی قدر وسعت سے کام لیتے ہوئے یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ متاخرین کی کتبِ سیرت، متقدمین کے سیر ومغازی سے متعلق ذخیرۂ حدیث کی شرح کا درجہ رکھتی ہیں، تاہم اس سے حدیث اور سیرت کے درمیان کوئی تفریق ثابت نہیں ہوتی۔

اور جہاں تک تیسری بات کا تعلق ہے، کہ اصحابِ سیرت کا معیارِ نقد اصحابِ حدیث سے فروتر ہے، تو اس سے متعلق ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ جب موصوف اصحابِ حدیث واصحابِ سیرت کو ایک ہی جماعت مانتے ہیں، تو اصحابِ حدیث کے مقابلے میں اصحابِ سیرت کے معیار کے فروتر ہونے کا شکوہ بے جا معلوم ہوتا ہے، مزید برآں معیارِ نقد ونظر کے فروتر ہونے کا الزام اربابِ سیرت کو دینا بھی درست نہیں، کیوں کہ یہ معیار ان کا خانہ ساز نہیں ہے، بل کہ نقدِ حدیث کی جس نکسال سے احکام وشرائع سے متعلق احادیث کی جانچ پرکھ کے معایر کا اجرا ہوا، سیرت سے متعلقہ معایر بھی اسی کے جاری کردہ ہیں، آئندہ سطور میں اس سے متعلق تفصیلی بحث آرہی ہے۔

بہ ہر حال مولانا حکیم دانا پوریؒ کے متذکرہ بالا تمام بیانات سامنے رکھنے سے مجموعی نتیجہ یہ ہی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف بھی حدیث اور سیرت کے مابین کسی حقیقی تفریق کے قائل نہیں ہیں۔

حدیث اور سیرت کے مابین تفریق، علامہ شبلی نعمانی کا نقطۂ نظر

سابقہ آرا کے برعکس علامہ شبلی نعمانیؒ (متوفی ۱۳۳۲ھ) کی رائے میں سیرت، فنِ حدیث سے الگ چیز ہے، اور ان دونوں کو ایک شے سمجھنا قلت علم اور فن سے ناآشنائی کی بنا پر ہے، موصوف نے اپنے اس نقطۂ نظر پر کچھ شواہد بھی پیش کئے ہیں، چناں چہ مقدمۂ سیرت النبی میں تحریر فرماتے ہیں:

> اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے لائق ہے جو آج کل کی قلتِ علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فنِ حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے جو

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی، اور چوں کہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں، جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً صحیح بخاری ومسلم، تو یہ کہنا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے کہ سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔ اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امورِ ذیل پیشِ نظر رکھنے چاہئیں:

۱۔ پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور اربابِ رجال کی اصطلاحِ قدیم یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے، چناں چہ ابنِ اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں، اور سیرت بھی..... فقہ کی بھی یہ ہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہ ہی طریقہ چلتا رہا، چناں چہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرتِ ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں، مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی وسیرت عام فنِ حدیث سے ایک الگ چیز ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اربابِ سیر اور محدثین، دو مقابل گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام اربابِ سیر ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری ومسلم (ایک طرف)، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام اربابِ سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیثِ صحیح تمام اربابِ سیر کی متفقہ روایت کے مقابلے میں بھی قابلِ ترجیح ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے، اور بعینہٖ فنِ حدیث نہیں ہے، اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجے شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فنِ صحاحِ ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے، یا ان دونوں کے ہم پلّہ ہے۔

۳۔ مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فنِ حدیث کے

اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس لئے اربابِ سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت ومغازی کا رتبہ فنِ حدیث سے کم رہا۔

۴۔ جس طرح امام بخاری ومسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک موجود ہیں، مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابنِ ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرتِ دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیلِ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوگیا کہ ہماری اس عبارت کا کہ سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی، اس کا کیا مطلب ہے، اور کہاں تک صحیح ہے۔(۳۹)

مذکورہ بالا اقتباس میں آپ نے علامہ شبلی نعمانیؒ کا موقف ان کے تمام شواہد کے ساتھ ملاحظہ فرمالیا، آیئے اب اس موقف پر تحلیلی وتجزیاتی نظر ڈالتے ہیں:

موصوف نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا کہ ''آج تک سیرت کی کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی''، پھر اس دعوی کی راہ ہموار کرنے کے لئے یہ بحث اٹھائی کہ حدیث اور سیرت کے مابین فرق ہے، اور چند دلائل بھی پیش فرمائے ہیں، یہ دعویٰ، اور اس کے اثبات کے لئے اٹھائی گئی بحث دونوں ہی محلِ نظر ہیں، تاہم یہاں چوں کہ حدیث اور سیرت کے باہم فرق کی بات چل رہی ہے، اس لئے پہلے ان شواہد کا جائزہ لیتے ہیں جو موصوف نے حدیث اور میرت میں فرق ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں کہ

۱۔ آپ نے حدیث اور سیرت کے مابین فرق ثابت کرنے کے لئے پہلی بحث یہ اٹھائی ہے:

محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاحِ قدیم یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے ہیں، تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانہ مابعد میں، مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں، اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فنِ حدیث سے ایک الگ چیز ہے۔

اس عبارت میں ایک مرتبہ پھر غور فرمایئے! کیا اتنی سی بات کہ تیسری صدی تک کتب مغازی وسیر میں سیرت کے نام پر صرف غزوات کا بیان ہوتا رہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دیگر پہلوؤں سے گفت گو نہیں رہی، حدیث اور سیرت کے مابین کوئی حقیقی تفریق ثابت کرسکتی ہے؟ کیا مغازی کے

ابواب، حدیث کا حصہ نہیں ہیں؟ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جامع صحیح میں کتاب المغازی کے عنوان کے تحت جو مواد جمع کیا ہے، وہ بلاشبہ حدیث ہے، لیکن اگر امام بخاری رحمہ اللہ کی اسی کتاب المغازی کو جامع صحیح سے الگ کر دیا جائے تو غزوات کے بیان پر مشتمل ہونے کی بنا پر اس کو مغازی نہیں کہا جا سکے گا؟ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے اہم پہلو پر مشتمل ہونے کی بنا پر اسے سیرت کہنا غلط ہوگا؟

۲۔ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ بعض موقعوں پر اربابِ سیر اور محدثین، دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام اربابِ سیرت ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری ومسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام اربابِ سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیثِ صحیح تمام اربابِ سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابلِ ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک، دو واقعے مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

اربابِ سیر اور اصحابِ حدیث کس حد تک الگ الگ گروہ ہیں اور کس حد تک ایک ہی جماعت؟ اس پر تفصیل سے بات ہو چکی ہے، اس کا اعادہ کئے بغیر اگلے نکتے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں کہ جناب نے اربابِ سیر اور محدثین کے مابین روایات کی تصحیح وتضعیف اور ترجیح وعدمِ ترجیح کے اختلاف کو ان کے درمیان تفریق کا قرینہ قرار دیا ہے، حال آں کہ یہ بات سراسر ناقابلِ قبول ہے، کیوں کہ ایسا اختلاف تو محدثین کرام کے مابین بھی بکثرت رہتا ہے، بل کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ (متوفی ۲۵۶ھ) اور امام مسلم رحمہ اللہ (متوفی ۲۶۱ھ) کے مابین بھی ہے، کہ ایک حدیث کی صحت پر امام مسلم رحمہ اللہ اور دیگر بیشتر محدثین متفق ہیں، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اسے اپنی جامع صحیح میں اسے جگہ دینے کو تیار نہیں، کیا حدیثِ معنعن میں امکانِ لقا اور ثبوتِ سماع کی شرط میں امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی بات ہے؟ صحیح مسلم میں کتنی احادیث ایسی ہیں جن کو امام مسلم نے اس شرط کے عدمِ لحاظ کی بنا پر صحیح کا درجہ دیا، جب کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کو نہ صحیح کا درجہ دیا اور نہ ہی جامع صحیح میں درج کیا؟ (۴۰) تو کیا اس اختلاف کی بنا پر ان ہیں الگ الگ گروہ قرار دیا جائے گا؟

مزید یہ کہ اس موقع پر جناب کے پیشِ نظر صرف وہ مثالیں ہیں، جن میں اربابِ سیر کی روایات کو صحیحین کی روایات کے پیشِ نظر مرجوح قرار دیا گیا، لیکن وہ مثالیں پیشِ نظر نہیں جہاں اربابِ سیر کی روایات کے مقابلے میں صحیحین تک کی روایات کے مرجوح ہونے کی اربابِ سیر نے نہیں، خود محدثین نے تصریح کی ہے، چناں چہ مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری رقم طراز ہیں:

اصحابِ سیرت جو باتیں بتاتے ہیں وہ تاریخ وار مسلسل اور مربوط ہوتی ہیں، احادیثِ صحیحہ

کے تمام واقعات بھی سیرت کی اس توضیح کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ نمایاں نظر آتے ہیں، محدثین اپنے اسانید عالیہ کے باوجود واقعات کو سمجھنے کے لئے اصحاب سیرت کے محتاج ہوتے ہیں، بل کہ بعض جگہ اپنے نقص کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

صحیح مسلم کی روایت ہے جس کی سند عالی ہونے میں شبہ نہیں کہ ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں ام حبیبہ کو آپ کے عقد میں دیتا ہوں، اور آپ نے قبول کیا، اصحاب سیرت کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، باتفاق اہل سیرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا عقد حبشہ میں ہوا، اور اس وقت ہوا جب ابوسفیان کافر اور محارب تھا، جمہور محدثین تسلیم کرتے ہیں کہ صحیح مسلم کی یہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔

بخاری کی روایت ہے کہ افک عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضور ﷺ نے مسجد میں فرمایا کہ کون ہے جو ان منافقوں کے مقابلے میں مستعد ہو؟ حضرت سعد بن معاذ کھڑے ہوئے، اور عرض کیا کہ میں مستعد ہوں یا رسول اللہ! اصحاب سیرت کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، اصحاب سیرت متفق ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا غزوۂ احزاب کے بعد بنی قریظہ کا فیصلہ کرکے انتقال ہوگیا، اور صحیح یہ ہے کہ غزوۂ مریسیع جس میں افک کا قصہ ہوا، وہ اس کے بعد ہوا، اس لئے حضرت سعد تو افک کے وقت تھے ہی نہیں، اکثر محدثین تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا نام اس روایت میں رواۃ کا تسامح ہے۔ (۴۱)

اس سے معلوم ہوا کہ محققین کا یہ کہنا کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلے میں بھی قابل ترجیح ہے اس اطلاق کے ساتھ خود محدثین کے ہاں بھی قابل قبول نہیں، نیز یہ بات اگر درست بھی ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ارباب سیر کی متفقہ روایت صرف اس وجہ سے قابل رد ہے کہ وہ اصحاب سیر ہیں اصحاب حدیث نہیں، بل کہ سند روایت کے درجۂ صحت پر فائز ہونے کی بنا پر ہے، چناں چہ اگر اسی درجے یا اس سے اعلیٰ درجے کی صحیح سند ارباب سیر کی کتب میں پائی جائے تو محققین کے ہاں اس کا بھی وہی درجہ ہوگا جو محدثین کی کتب میں پائی جانے والی صحیح حدیث کا ہے، بل کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوجائے کہ ایک جانب کتب حدیث سے منقول صحیح لغیرہ کے درجے کی حدیث ہو اور دوسری جانب ایسی حدیث ہو جو کتب سیرت میں مروی ہے، لیکن اس کے تمام راوی صحیحین کے رجال میں سے ہیں، تو اہل خبر سے مخفی نہیں کہ لامحالہ اس روایت سیرت ہی کو ترجیح دی جائے گی۔ (۴۲)

سابقہ بیان کی دو مثالیں تحریر کرنے بعد رقم طراز ہیں:

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے، اور بعینہٖ فنِ حدیث نہیں ہے، اور اس بنا پر روایتوں میں اس درجہ شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فنِ صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے، یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

عرض یہ ہے کہ سیرت کو بعینہٖ فنِ حدیث نہیں، بل کہ حدیث کی ایک ذیلی شاخ اور فرع کہتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے بہ جائے خود ایک درخت کی شکل اختیار کر گئی ہے، اور اس سے مزید کئی شاخیں پھوٹ نکلی ہیں، جن میں سے ہر شاخ اپنی جگہ ثمر بار بھی ہے، تاہم اس کی جڑ، حدیث کے شجرۂ طیبہ سے وابستہ ہے۔

رہی یہ بات کہ سیرت کی روایتوں میں اس درجہ شدتِ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی جو فنِ صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے تو یہ بھی بڑی تعجب خیز بات ہے، لہٰذا پہلے تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ فنِ صحاح ستہ بھی کوئی باقاعدہ فن ہے؟ پھر یہ کہ صحیحین کے علاوہ بقیہ چار کتب صحاح جو دراصل کتب سنن ہیں، ان میں وہ کون سی غیر معمولی شدتِ احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے جو ان کے علاوہ کسی کتاب میں نہیں؟ باخبر اہلِ علم سے ہرگز پوشیدہ نہیں ہے کہ کتب حدیث میں کتنی ہی کتابیں ایسی ہیں جو شدتِ احتیاط پر مبنی شرائط کے لحاظ سے ان صحاحِ اربعہ یا بالفاظِ دیگر ان سننِ اربعہ سے برتر ہیں، (۴۳) بس شہرت اور تداول کی وجہ سے متاخرین نے ان چاروں کو بھی صحیحین کے ساتھ ملا کر تغلیباً صحاح ستہ کہنا شروع کر دیا گیا (۴۴) اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ چھ کتابیں بہ ذاتِ خود کوئی فن ہیں، یا ان میں سے ہر ایک کی شرائطِ حدیث ایسی ہیں کہ جن کی نظیر دیگر کتبِ حدیث میں ملنا مشکل ہے۔

مزید برآں یہ بات بھی خوب ہے کہ جس طرح قرآن وحدیث سے ماخوذ ہونے کے باوجود فقہ کو بعینہٖ قرآن وحدیث یا اس کے ہم پلہ کہنا درست نہیں اسی طرح سیرت کو بھی حدیث کا حصہ کہنا درست نہیں، اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی جرات کئے بغیر ہم یہاں صرف یہ سوال اُٹھانا چاہیں گے کہ کبھی کسی نے کتب فقہ کی عبارات کے حق میں آیات یا احادیث کے الفاظ استعمال کئے ہیں؟ ان کے لئے متواتر، مشہور یا کم از کم خبرِ واحد کے درجے کی سند کو لازم قرار دیا ہے؟ ان میں اصولِ ترتیل یا اصولِ حدیث کو جاری کیا ہے؟ ان کو جانچنے کے لئے اصولِ روایت ودرایت کی بحثیں چھیڑی ہیں؟ ان کے بارے میں صحیح، حسن، مرسل ومنقطع جیسی اصطلاحات استعمال کی ہیں؟ لیکن روایاتِ سیرت کے ساتھ یہ سب کچھ، نہ صرف یہ کہ متقدمین کے زمانے سے چلا آرہا ہے، بل کہ آں جناب نے بھی اپنی سیرت میں دل کھول کر روا رکھا ہے، تو

آپ ہی فرمائیے کہ سیرت کو فقہ پر قیاس کر کے اسے حدیث سے علیحدہ ثابت کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

۴۔ مزید تحریر فرماتے ہیں:

مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فنِ حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس لئے اربابِ سیر کو تنقید وتحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت ومغازی کا رتبہ فنِ حدیث سے کم رہا۔

اس میں یہ بات تو بہ جا ہے کہ سیرت سے متعلق ہر ہر جزئی تفصیل کا کڑی شرائط پر پورا اترنا ممکن نہیں، تاہم اس بنا پر تنقید وتحقیق کے معیار میں کمی ارباب سیر نے اپنے صواب دیدی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کی ہے، یا اس کا راستہ بھی ان ہیں محدثین نے ہی دکھایا ہے؟ یہ بحث ان شاء اللہ مستقل عنوان کے تحت آرہی ہے۔

ہاں! فرقِ مراتب سے ہمیں انکار نہیں، کہ وہ روایاتِ سیرت جو صحتِ حدیث کے معیار پر پوری نہیں اترتیں ان کا وہ مرتبہ ہرگز نہیں جو معیارِ صحت پر فائز احادیث کا ہے، تاہم سوال یہ ہے کہ یہ فرقِ مراتب تو خود صحاحِ ستہ کی احادیث کے درمیان بھی ہے کہ کچھ ان میں سے درجۂ تواتر میں ہیں، تو کچھ درجۂ شہرت میں، کچھ نے غریب ہونے کے باوجود صحیح کا درجہ پالیا ہے، کچھ حسن اور کچھ ضعیف بھی ہیں، ان ہی میں کچھ نہ کچھ مواد ایسا بھی ہے جس پر بعض ناقدین کو وضع تک کا گمان ہے۔ (۴۵) نیز خود صحیح میں بھی لذاتہ اور لغیرہ کی بنا پر فرقِ مراتب ہے، اسی طرح حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ کا فرق بھی ہے، چناں چہ کچھ ضعیف احادیث ایسی بھی ہیں جو کثرتِ طرق وشواہد کی بنا پر صالح کی سند پا کر انہی صحیح وحسن احادیث کا پڑوس حاصل کر چکی ہیں۔ محدثین کرام تو ایک طرف محققین ارباب سیر کو بھی ہمیشہ ان مراتب کے مابین فرق کا پاس رہا ہے، وہ بھی فروتر درجے کی روایت کو برتر درجے کی حامل حدیث کے ہم پلہ قرار نہیں دیتے۔ (۴۶) تاہم اس فرقِ مراتب کی بنا پر وہ فروتر درجہ والی روایات کو حدیث ہونے سے خارج بھی نہیں کرتے۔

مذکورہ بالا تجزیے کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کا یہ بیان، حدیث اور سیرت کے درمیان حقیقی تفریق کے اثبات کے لئے ناکافی ہے۔

سابقہ کتبِ سیرت اور التزامِ صحت

اس بحث کے آخر میں علامہ شبلی نعمانی نے ایک بار پھر اپنے اس دعوے کو دہرایا ہے:

جس طرح امام بخاری ومسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا۔

پہلی بات تو یہ کہ ہر ہر چیز میں صحیحین جیسے معیارِ صحت کا مطالبہ ہی درست نہیں، کیوں کہ یہ معیار تو اس ذخیرۂ حدیث میں بھی نہیں ہوسکتا جو اوامر ونواہی اور احکام وشرائع سے متعلق ہے، جس کے حدیث ہونے کے آپ بھی قائل ہیں، حتیٰ کہ سنن اربعہ میں بھی یہ معیار برقرار نہیں رکھا جا سکا۔ (۴۷)، تو ذخیرۂ سیرت کی ہر ہر جزئی کے لئے اس درجہ کے معیارِ صحت اور اس کے التزام کا مطالبہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟ بل کہ روایاتِ سیرت کے قابلِ قبول ہونے کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ سیر ومغازی کے لئے محدثین کے بنائے ہوئے روایت ودرایت کے اصولوں کے پر پورا اترے۔ (۴۸) یہی وجہ ہے کہ خود علامہ شبلی نعمانی بھی سیرت کے سارے مواد کو صحیحین کے معیار کے مطابق درج نہیں کر سکے (۴۹) تو کسی دوسرے سے یہ مطالبہ کس بنا پر ہوسکتا ہے؟

جب کہ یہ دعویٰ بھی حق بہ جانب نہیں کہ آج تک صحت کے التزام کے ساتھ سیرت کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، حال آں کہ جناب مغازیٔ موسیٰ بن عقبہ سے ہرگز ناواقف نہیں۔ (۵۰) جو نہ صرف بعد کی تمام معتبر کتبِ سیرت کا بنیادی ماخذ ہے، بل کہ اس معیار پر بھی پوری اترتی ہے جس کا آں جناب نے ذکر کیا ہے، اسے اصح المغازی کی باقاعدہ اور مصدقہ سند ملی ہے، چناں چہ امام مالک رحمہ اللہ (متوفی ۱۷۹ھ) فرماتے تھے:

علیك بمغازی الرجل الصالح موسی بن عقبة فإنها اصح المغازی

اور امام شافعی رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۴ھ) فرماتے تھے

لیس فی المغازی اصح من کتابه مع صغره وخلوه من اکثر ما یذکر فی کتب غیره

اور امام یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۳ھ) فرمایا کرتے تھے:

کتاب موسی بن عقبة عن الزهری من اصح هذه الکتب (۵۱)

یہ سند بھی کسی ایک شخص کی عطا کردہ نہیں ہے کہ اسے کسی کا شخصی خیال قرار دیا جائے، بل کہ تین تین جلیل القدر ائمۂ حدیث وفقہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام یحییٰ بن معین کی جاری کردہ ہے۔ (۵۲) پھر آج تک محدثین کرام اس سند پر اپنے تصدیقی وتائیدی تحفظ ثبت کرتے چلے آئے ہیں، حتیٰ کہ امام

بخاری رحمہ اللہ نے بھی جامع صحیح میں اس پر اعتماد اور اس سے استفادہ کیا ہے۔(۵۳) بل کہ لطف کی بات یہ ہے کہ صحیح بخاری کو جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی سند ملی وہ بھی اس سندِ اصح المغازی کے بعد کی ہے، گویا یہ اصحیت اور اس کے مراتب کا لحاظ تو دیگر اصنافِ حدیث سے پہلے ہی سیرت میں ہو چکا تھا۔

علاوہ ازیں اس بارے میں علامہ شبلی نعمانی کی باتوں میں تضاد بھی ہے، چناں چہ آپ اسی مقدمے میں کچھ آگے چل کر قدیم سیرت نگاروں کی فہرست میں امام ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ) کی کتاب الشمائل کو کتبِ سیرت میں اور اسی کی بہ دولت امام ترمذیؒ کو سیرت نگاروں میں شمار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> محمد بن عیسیٰ ترمذی مشہور محدث ہیں، سیرتِ نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے، جس کا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات وعادات واخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں۔(۵۴)

غور فرمایئے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی کتاب شمائل جو خالص حدیث کی کتاب ہے، اور اس میں کتبِ سیرت کی ان خصوصیات میں سے کوئی ایک بھی نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر ماقبل میں حدیث اور سیرت کے مابین فرق کیا جارہا تھا، لیکن اس کے باوجود موصوف نے نہ صرف یہ کہ شمائل کو سیرتِ نبوی کا ایک خاص رسالہ قرار دیا، بل کہ یہ بھی اعتراف کرلیا کہ اس میں صحیح اور معتبر روایتوں کے درج کرنے کا التزام بھی ہے:

کیا احادیثِ احکام اور روایاتِ سیرت ہم پلّہ ہیں؟

اتنی بات تو مسلّم ہے کہ مختلف اقسام کی احادیث کے مابین فرقِ مراتب ہے، اور علی الاطلاق روایاتِ سیرت کو احادیثِ احکام کے ہم پلّہ نہیں کہا جا سکتا، نیز مجموعی حیثیت سے احادیثِ احکام کو روایاتِ سیرت پر فوقیت دینا بھی اس لحاظ سے درست ہے کہ احادیثِ احکام میں ناقدینِ حدیث نے کڑی شرائط کے تحت نقد ونظر کا اچھا خاصا کام کیا ہے، چوں کہ نقد ونظر کے بغیر استنباطِ احکام ممکن ہی نہ تھا، اس لئے ان میں نقد ونظر کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا، جب کہ بیشتر روایاتِ سیرت سے استنباطِ احکام کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اس لئے اس باب میں اس حد تک نقد ونظر کا کام بھی نہ ہوسکا، تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ حدیث کی اقسام سے ہی خارج ہیں۔

اسی طرح احادیثِ احکام کے برتر اور روایاتِ سیرت کے فروتر ہونے کے معنی یہ نہیں کہ احادیثِ

احکام میں سے ہر ہر حدیث، روایاتِ سیرت میں سے ہر ہر روایت کے مقابلے میں برتر ہے، یا یہ کہ کسی حدیث کو محض اس بنا پر ترجیح دی جائے کہ وہ کتبِ احادیثِ احکام میں مروی ہے، اور کسی حدیث کو صرف اس بنا پر مرجوح قرار دیا جائے کہ یہ کتبِ سیرت میں مروی ہے، کیوں کہ ناقدینِ حدیث کے ہاں، فرقِ مراتب کا معیار یہ نہیں کہ یہ حدیث، کتبِ حدیث میں مروی ہے، اس لئے برتر ہے، اور یہ حدیث کتبِ سیرت میں مروی ہے اس لئے فروتر ہے!

اس اجمال کی تفصیل میں پہلی بات تو یہ ہے کہ احادیثِ احکام ہوں یا روایاتِ سیرت، یا کوئی اور بابِ علم، جب بھی کوئی بات آں حضرت ﷺ کی طرف منسوب کی جائے گی تو اس کے لئے اوّلین شرط سند ہوگی، بلا سند آں حضرت ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت کی ہرگز اجازت نہیں۔ (۵۵)

دوسری بات یہ ہے کہ کسی حدیث وروایت کے صحیح یا ضعیف ہونے کا مدار اس کی سند اور متن پر ہے، یعنی کسی حدیث یا روایت کی صحت وضعف کے فیصلے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اس کی سند کے تمام راویوں کو جانچا، اور متن کے معانی کو دیگر اصولِ مسلّمہ کی روشنی میں پرکھا جائے۔ (۵۶)

جب مذکورہ بالا دونوں باتیں سامنے رکھی جائیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ احادیثِ احکام ہوں یا روایاتِ سیرت، دونوں کی صحت وضعف کے معلوم کرنے کی ایک ہی کسوٹی ہے، سند اور متن، چناں چہ کتبِ احادیث میں مذکور کوئی روایت اگر ایسی ہے کہ وہ ناقدین کے اصولِ نقدِ سند ومتن پر پوری نہیں اترتی، تو محض اس وجہ سے کہ وہ کتبِ احادیث میں مذکور ہے، اس کو کوئی امتیازی درجہ نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح اگر ایک روایتِ سیرت ایسی ہے کہ اس کا وجود صرف کتبِ سیرت میں ہے، کتبِ احادیث میں اس کا نام ونشان بھی نہیں، البتہ کتبِ سیرت میں وہ کسی ایسی سند سے مروی ہے جس پر ناقدینِ حدیث کی جانب سے اصح الاسانید کی مہر لگی ہوئی ہے، یا وہ ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے جنہیں اربابِ صحاح نے ملحوظ رکھا ہے، تو لامحالہ اس کو نفسِ صحت میں وہی درجہ دینا ہوگا جو کتبِ حدیث میں اس جیسی دیگر احادیث کو دیا جاتا ہے، محض اس بنا پر کہ وہ روایتِ سیرت ہے، اس کے ساتھ کوئی امتیازی رویہ اختیار کرنا، خلافِ قاعدہ ہوگا۔ (۵۷)

گویا کہ بات کتبِ حدیث یا کتبِ سیرت میں مروی ہونے کی نہیں، بل کہ بات سند ومتن کے معیار کی ہے، اب یہ معیارِ متن وسند اگر کتبِ حدیث میں مروی احادیث میں ہو تو بھی سر آنکھوں پر، اور اگر کتبِ سیرت میں مروی کسی حدیث میں پایا جائے تو وہ بھی اسی طرح علی الراس والعین سمجھی جائے گی۔

اور جہاں تک فرقِ مراتب کی بات ہے تو یہ روایاتِ سیرت کا خاصہ ہی نہیں، بل کہ تمام اصنافِ

احادیث میں ہے، مفتی محمد شفیعؒ کی ایک تحریر سے اقتباس لائقِ ملاحظہ ہے:

اسلام میں اعتماد واعتبار کا جو مقام قرآنِ کریم اور احادیثِ متواترہ کا ہے وہ عام احادیث کا نہیں، جو حدیثِ رسول کا درجہ ہے وہ اقوالِ صحابہ کا نہیں، اسی طرح تاریخی روایات کے اعتماد واعتبار کا بھی وہ درجہ نہیں ہے، جو قرآن وسنت یا سندِ صحیح سے ثابت شدہ اقوالِ صحابہ کا ہے.....اعتبار واعتماد کی یہ درجہ بندی کسی فن کی عظمت واہمیت کو گھٹاتی نہیں، البتہ شریعت اور اس کے احکام کی عظمت کو بڑھاتی ہے، کہ ان کے ثبوت کے لئے اعتماد واعتبار کا نہایت اعلیٰ درجہ لازم قرار دیا گیا ہے، پھر احکامِ شرعیہ میں بھی تقسیم کر کے عقائدِ اسلامیہ کے ثبوت کے لئے ہر شرعی دلیل بھی کافی نہیں سمجھی جاتی، جب تک قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت نہ ہو، باقی احکامِ عملیہ کے لئے عام احادیث جو قابلِ اعتماد سند کے ساتھ منقول ہوں وہ بھی کافی ہوتی ہیں۔(۵۸)

جب تمام کتبِ حدیث میں درج احاذیث وروایات میں، صحت وقبول کے لحاظ سے فرقِ مراتب ہے، تو روایاتِ سیرت میں بھی فرقِ مراتب ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، لہٰذا یہ بات تو کہی جاسکتی ہے کہ کتبِ سیرت کی روایات میں اس معیارِ صحت پر فائز احادیث نسبتاً کم اور احادیثِ احکام میں نسبتاً زیادہ ہیں، لیکن اس بنا پر سیرت کو حدیث سے الگ سمجھنا درست نہیں، کیوں کہ بالکل یہ ہی بات تو اُن کتبِ حدیث میں بھی پائی جاتی ہے جنہیں محدثینِ کرام کتبِ حدیث کے تیسرے درجے میں شمار کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے حوالے سے مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۷۰ء) تحریر فرماتے ہیں:

کتبِ حدیث مقبول وغیر مقبول ہونے کے اعتبار سے پانچ قسم پر ہیں:

تیسری قسم: وہ کتابیں ہیں جن میں حسن، صالح، منکر، ہر نوع کی حدیثیں ہیں، جیسے سننِ ابن ماجہ، مسندِ طیالسی، زیاداتِ ابن احمد بن حنبل، مسندِ عبدالرزاق، مسندِ سعید بن منصور، مصنفِ ابی بکر بن ابی شیبہ، مسندِ ابویعلیٰ موصلی، مسندِ بزار، مسندِ ابن جریر، تفسیر ابن جریر، تفسیرِ ابن جریر، تاریخ ابن مردویہ، تفسیرِ ابن مردویہ، طبرانی کے معجم کبیر، معجم صغیر، معجم اوسط، سننِ دارقطنی، غرائبِ دارقطنی، حلیہ ابی نعیم، سننِ بیہقی، شعب الایمان بیہقی۔(۵۹)

بل کہ اس معیار میں کتبِ حدیث کی چوتھی قسم تو شاید کتبِ سیرت سے بھی فروتر ہے، ملاحظہ فرمائیے:

چوتھی قسم: وہ کتابیں ہیں جن میں سب حدیثیں ضعیف ہیں إلا ماشاء اللہ، جیسے نوادر الاصول حکیم ترمذی، تاریخ الخلفاء، تاریخ ابن نجار، مسند الفردوس دیلمی، کتاب الضعفاء عقیلی، کامل ابن عدی، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ ابن عساکر۔ (۶۰)

لہٰذا تیسرے اور چوتھے درجے کی مذکورہ بالا کتب اگر ہر طرح کی معتبر وغیر معتبر روایات پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی کتب حدیث ہی کہلاتی ہیں، تو کتب سیرت سے ان کی یہ بنیادی شناخت کیوں کر چھینی جاسکتی ہے؟

روایاتِ سیرت اور نقد ونظر کا دائرۂ کار

اسلام نے نہ تو نقد ونظر پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد کی ہے، اور نہ ہی عقلوں پر پہرے بٹھائے ہیں، اسلام کی نظر میں تحقیق وتنقید بہ ذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں، خود قرآنِ کریم نے اس کی طرف دعوت دی ہے، سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن کے عنوان سے اللہ تعالیٰ نے صالح اور نیک بندوں کی جو صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

والذین إذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا (الفرقان:۷۳)

اللہ کے یہ صالح اور نیک بندے آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہروں کی طرح نہیں گر پڑتے کہ بے تحقیق جس طرح اور جو چاہیں عمل کرنے لگیں، بل کہ خوب سمجھ بوجھ کر بصیرت کے ساتھ عمل کرتے ہیں، بل کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حدیث اور نقد ونظر کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے، جیسا کہ روح اور جسم کا باہمی تعلق ہے، تو جو تاریخ تدوینِ حدیث کی ہے وہی تاریخ نقد ونظر کی ہے۔ (۶۲)

ہر ذی شعور جانتا اور مانتا ہے کہ ہر چیز اور کام کی کچھ حدود ہوتی ہیں، ان کے دائرے میں رہ کر جو کام کیا جائے وہ مقبول ومفید ہوتا ہے۔ حدود واصول توڑ کر جو کام کیا جائے وہ کبھی بھی قابلِ قدر نہیں سمجھا جاتا، چناں چہ سیرت یا احادیثِ سیرت میں نقد ونظر کا بنیادی قاعدہ بھی یہ ہی ہے، قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک ناقدین، سیرت اور اس کے علاوہ دیگر اقسامِ حدیث کی چھان پھٹک کرتے چلے آئے ہیں، اس عمل کو کبھی کسی نے برا نہیں کہا، بل کہ ہمیشہ اسے حدیث وسیرت کی خدمت ہی سمجھا گیا، آج بھی اگر ان ہی حدود وقیود کو ملحوظ رکھ کر سیرت میں نقد ونظر کا عمل جاری ہو تو نہ صرف یہ کہ قابلِ قبول، بل کہ باعثِ صد ستائش ہوگا۔

تاہم سیرت میں نقد ونظر کی اس وادیٔ پُر خار میں قدم رکھنے سے پہلے پیشِ نظر ہونا ضروری ہے کہ یہ

کسی عام لیڈر، یا دنیوی مقنن کی سوانح عمری نہیں، جو چند تاریخی حکایات اور بے سند باتوں کا مجموعہ ہو، جس کو پرکھنے کے لئے عقلی قرائن کے سوا کوئی ذریعہ ہی نہ ہو، بل کہ یہ اس صاحبِ شریعت کے قول وفعل اور حالاتِ زندگی کی حکایت ہے جس کی شریعت قیامت تک آنے والے ہر ذی شعور کے لئے واحد طریق نجات ہے، یہاں ذرا سی غفلت سے منزل کھوٹی ہونے، اور ذرا سے قدم ڈگمگانے سے اندھیری گھاٹیوں میں گرتے چلے جانے کا کھٹکا ہر دم دامن گیر ہے، حکیم عبدالرؤف داناپوری نے کیا خوب صورت بات تحریر فرمائی ہے:

> یہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے، آپ کا ایک ایک لفظ، اور ایک ایک فعل اسلام کے لئے حجت ہے، روایات کے الفاظ اور مفاہیم کے ادنی تغیر سے مذاہب بن گئے ہیں، اس لئے ہر ہر سطر، ہر ہر لفظ، اور ہر ہر روایت کو بڑی جانچ اور بڑی احتیاط سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ (۶۳)

لہٰذا نہ تو کوئی بات بلا سند واستناد آں حضرت ﷺ کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے، اور نہ ہی آپ ﷺ سے متعلق ہر ہر بات میں یہ اختیار دیا جاسکتا ہے کہ آزادئ رائے یا نقد ونظر کے لے میں بہہ کر اس کو ہدفِ تنقید بنالیا جائے، چناں چہ آں حضرت ﷺ کے حوالے سے جو اشیا اسلام میں مسلمہ عقائد کے درجے میں ہیں، یا قرآنِ کریم اور احادیث متواترہ ومشہورہ سے ثابت شدہ قطعیات کے درجے میں، یا عصمتِ انبیاء اور ناموسِ رسالت کے لحاظ سے اصول وکلیات کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں نقد ونظر کی گنجائش نہیں ہے، البتہ جو اشیا ظنیات کے درجے میں ہیں، کسی قطعی دلیل سے ان کا ثبوت نہیں ملتا، ان سے متعلق روایات پر نقد ونظر، اگر ناقدینِ حدیث کے بیان کردہ اصولِ روایت ودرایت کی روشنی میں ہو، اس قسم کی کسی روایت کے ثبوت وعدمِ ثبوت، صحت وعدمِ صحت یا قبول وعدمِ قبول کی بات ہو اور آدابِ نقد ونظر کا لحاظ رکھ کر اس پر تنقید کی جائے، تو یہ کل بھی خدمتِ سیرت تھا، اور آئندہ بھی خدمت ہی رہے گا، تاہم یہ خیال رہنا ضروری ہے کہ اس تنقید کا اثر اس روایت تک موقوف رہے، جس شخصیت کی طرف اس روایت کی نسبت کی جارہی ہے، اس کی شان میں کسی قسم کی گستاخی اور بے ادبی نہ مغربی ناقدین کی جانب سے قابلِ قبول ہے، اور نہ ہی ان نام نہاد مشرقی دانش وروں کی جانب سے، جو اُن مغربی ناقدین کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہیں۔

اربابِ سیرت اور ناقدینِ حدیث کے اصولِ نقد ونظر

جب یہ طے ہے کہ سیرت، حدیث ہی کی ایک قسم ہے، تو ظاہری بات ہے کہ احادیثِ سیرت

کے نقد ونظر کے اصولِ روایت ودرایت بھی وہی ہیں جو دیگر اقسام حدیث کے نقد ونظر کے لئے ناقدینِ حدیث نے وضع کیے، تاہم سابقہ مضامین کے مطالعے کے دوران کئی بار یہ بات بھی سامنے آئی

اربابِ سیر نے وہ احتیاط نہیں برتی جو محدثین نے احکام کی احادیث کے بارے میں برتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اربابِ سیر نے سیرت کے لئے ناقدینِ حدیث کے طے کردہ اصولِ روایت ودرایت سے انحراف کیا، یا ان کے اجر میں کم زوری دکھائی اور ان پر سختی سے کاربندِ عمل نہیں رہے؟ یا اس نرم روی کا راستہ خود اُن ناقدینِ حدیث نے ہی ان ہیں دکھایا؟

واقعہ یہ ہے کہ اس الزام میں تمام اربابِ سیرت کو اس طرح ایک کمان سے نشانہ بنانا روا نہیں، کیوں کہ دورِ قدیم کے بیشتر سیرت نگاروں کے ہاں نقد ونظر سے زیادہ ذخیرۂ سیرت کی حفاظت اہم تھی، اس لئے انہوں نے اپنی زیادہ کاوشیں اسی پر صرف کیں، تاکہ مختلف اسالیب اور عناوین کے تحت جس قدر ہو سکے روایاتِ سیرت کو جمع کر دیا جائے، بایں ہمہ دورِ قدیم میں ایسے سیرت نگار بھی رہے، جنہوں نے ذخیرۂ سیرت میں نقد ونظر سے کام لیا۔ (۶۴) تاہم اگر انہوں نے اس بارے میں کوئی نرم روی اختیار کی تو اس میں ان سے زیادہ ناقدینِ حدیث ہاتھ ہے، کیوں کہ احادیثِ سیرت اور احادیثِ احکام کا یہ فرق اربابِ سیر کا قائم کردہ نہیں، بل کہ ناقدینِ حدیث کے معاییرِ نقد ونظر کا ہی حصہ ہے، چناں چہ ناقدینِ حدیث کے سرخیل حافظ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (متوفی ۱۹۸ھ) سے بہ سندِ متصل منقول ہے:

عن عبد الرحمن بن مهدی يقول إذا روينا عن النبیﷺ فی الحلال والحرام والاحكام شددنا فی الاسانيد وانتقدنا الرجال وإذا روينا فی فضائل الاعمال والثواب والعقاب والمباحات والدعوات تساهلنا فی الاسانيد (٦٥)

اسی طرح چوٹی کے ناقدِ حدیث حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (متوفی ۲۴۱ھ) سے منقول ہے:

إذا روينا عن رسول اللهﷺ فی الحلال والحرام والسنن والاحكام تشددنا فی الاسانيد وإذا روينا عن النبیﷺ فی فضائل الاعمال وما لا يضع حكما ولا يرفعه تساهلنا فی الاسانيد (٦٦)

امامِ جرح وتعدیل ابوعبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی (متوفی ۳۲۷ھ) اپنی مایۂ ناز کتاب الجرح والتعدیل کے مقدمے میں راویانِ حدیث کی شرائط، اقسام اور ان سے متعلق حکم بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ومنهم الصدوق الورع المغفل الغالب عليه الوهم والخطا والسهو والغلط فهذا يكتب من حديثه الترغيب والترهيب والزهد والاداب ولا يحتج بحديثه فى الحلال والحرام (٦٧)

یہی فرق امام المحدثین سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ)، امام عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ)، امام سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ)، سید الحفاظ امام یحیی بن معین (متوفی ۲۳۳ھ)، اور امام ابوزکریا عنبری (متوفی ۳۴۴ھ) رحمہم اللہ جیسے محدثین ناقدین سے بھی منقول ہے۔ (۶۸)

گویا کہ متقدمین ومتاخرین ائمۂ جرح وتعدیل اور ناقدینِ حدیث اسی خیال کے حامل تھے، حتی کہ حافظ المغرب علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمہ اللہ (المتوفی ۴۶۳ھ) نے تو اسے تمام محدثین کا مشترکہ موقف کہا ہے:

واهل العلم بجماعتهم يتساهلون فى الفضائل فيروونها عن كل وانما يتشددون فى احاديث الاحكام (٦٩)

حافظ ابوبکر خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) بھی اسلاف کے حوالے سے اسی قسم کی بات نقل کرتے ہیں:

باب التشدد فى احاديث الاحكام والتجوز فى فضائل الاعمال: قد ورد عن غير واحد من السلف انه لا يجوز حمل الاحاديث المتعلقة بالتحليل والتحريم الا عمن كان برينا من التهمة بعيدا من الظنة واما احاديث الترغيب والمواعظ ونحو ذلك فإنه يجوز كتبها عن سائر المشايخ (٧٠)

اسی لئے بعد کے بیشتر محدثین اور اربابِ مصطلح الحدیث نے بھی اسی بات کو اپنی کتب اصولِ حدیث میں بہ طورِ قاعدہ ذکر کیا ہے، چناں چہ علامہ عبدالحئی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وليعلم ان الاحكام وغير الاحكام، وإن كانت متساوية الاقدام فى الاحتياج إلى السند، وما خلا عن السند فهو غير معتمد، إلا ان بينهما فرقا من حيث إنه يشدد فى اخبار الاحكام من الحلال والحرام، وفى غيرها يقبل الاسناد الضعيف بشروط صرح بها الاعلام (٧١)

اب انصاف سے فرمائیے کہ اگر نقادِ حدیث کے ان جیسے بیانات اور قواعد کی روشنی میں سیرت نگاروں نے درج ذیل نتیجہ اخذ کیا تو اس میں ان کا کیا قصور ہے:

ولا يخفى ان السير تجمع الصحيح والسقيم والضعيف والبلاغ والمرسل والمنقطع والمعضل دون الموضوع ومن ثم قال الزين العراقي رحمه الله:

وليعلم الطالب ان السيرا تجمع ما صح وما قد انكرا وفي الاصل والذى ذهب إليه كثير من اهل العلم الترخص في الرقائق ومالا حكم فيه من اخبار المغازى وما يجرى مجرى ذلك وانه يقبل منها مالا يقبل في الحلال والحرام لعدم تعلق الاحكام بها (۷۲)

معلوم ہوا کہ سیرت میں ''صحیح'' و''حسن'' کے ساتھ ساتھ تمام انواعِ ضعیف بھی کام آتی ہیں، بہ شرطے کہ ضعفِ شدید یا وضع کے درجے میں، اور اپنے سے کسی برتر نص سے متعارض نہ ہوں، یہ اصول اربابِ سیر نے از خود نہیں بنائے بل کہ ناقدینِ حدیث کے ہی فراہم کردہ ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل کے تناظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دورِ قدیم میں سیرت نگاروں کے دو بنیادی مقصد رہے، ان ہی مقاصد کے تحت سیرت نگاری میں انہوں نے رویئے بھی دو طرح کے اختیار کیے:

۱۔ جن حضرات کے پیشِ نظر موادِ سیرت کی جمع وتدوین تھی انہوں نے سیرت اور مغازی سے متعلق ہر طرح کی احادیث اور آثار جمع کر دیے۔

۲۔ اور جن حضرات کے پیشِ نظر جمع وتدوین کے ساتھ ساتھ تنقیح وتنقید بھی رہی، انہوں نے ناقدینِ حدیث کی ہدایات کے تحت ان میں نقد ونظر سے کام بھی لیا۔

دیکھا جائے تو دونوں کام ہی اپنے اپنے موقع پر انتہائی قابلِ قدر ہیں۔ اگر پہلی جماعت یہ طے کر لیتی کہ کڑی شرائط طے کر کے، صرف ان شرائط پر پورا اترنے والی احادیث وروایات کی جمع وتدوین کی جائے، تو آج سیرت سے متعلق ہر موضوع پر جو عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے، نہ یہ سارا ذخیرہ محفوظ ہوتا اور نہ ہی بعد میں آنے والوں کے ذوقِ نقد ونظر کا سامان ہوتا، چناں چہ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں ہے کہ کئی روایاتِ سیرت یا احادیث ایسی ہیں کہ مختلف کتب میں مروی ان کی مختلف اسانید میں سے، ہر سند بہ جائے خود اس بات کے اثبات کے لئے ناکافی ہے، لیکن ان سب سندوں اور طُرق کو یک جا سامنے رکھنے سے ان کے مشترک معنی ثابت ہو جاتے ہیں، اگر ایسا ہوتا کہ ہر مؤلف اپنی روایت کی سند کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر مسترد کر دیتا، اور محفوظ نہ کرتا تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کا منفی نتیجہ اس قابلِ قدر ذخیرے کے ضیاع کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہوتا، جب ذخیرہ ہی نہ ہوتا تو نہ یہ علمی بزم آرائیاں ہوتیں، نہ بحث ومباحثے کی یہ گرم جوشیاں، اور نہ ہی نقد ونظر کے ذوق کی تسکین!

بہ ہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ارباب سیرت کی کتب میں رطب ویابس سب کچھ آ گیا، اور دیگر وجوہات میں سے اس کی ایک وجہ، اُن میں سے بعض حضرات کا تساہل بھی ہے، لیکن اس کی وجہ سے سب کو قصوروار ٹھہرانا، یا پورے ذخیرے پر یک سر حکم لگانا ہرگز مناسب نہیں، چناں چہ کتب حدیث میں بھی ایسی کتب کی کمی نہیں، جو اس بارے میں کتب سیر سے بھی آگے ہیں، جیسا کہ حکیم عبدالرؤف دانا پوری رقم طراز ہیں:

> الغرض محدثین کے یہاں جو صحیح روایتیں ہیں، اصحاب سیرت کو ان کی ترجیح میں کلام نہیں ہے، لیکن ان کو اپنی ضروریات کے لئے اور روایتیں بھی لینی پڑتی ہیں، جس کے لئے وہ اپنا معیار الگ قائم کرتے ہیں، بلاشبہ جس طرح حدیث کی کتابوں میں محدثین کے شدید احتیاط کے باوجود بہت سی غلط اور موضوع روایتیں داخل ہوگئی ہیں، اس طرح سیرت میں بھی بہت سی موضوعات ہیں، لیکن ان موضوعات کو خارج کر دیا جائے تو دنیا کے کسی قوم کی کوئی تاریخ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لئے کہ اور کہیں نہ سند ہے نہ موضوعات کو جدا کیا جا سکتا ہے۔ (۷۳)

دورِ قدیم کے اصولِ نقد ونظر اور دورِ جدید کے سیرت نگاروں کے رویے

علمی وسائل کی فراوانی، اور مغربی ناقدین کی طرف سے سیرت کے تنقیدی مطالعے نے نقد ونظر کو دورِ جدید کی سیرت نگاری کا لازمی حصہ بنا دیا، اسی لئے دورِ قدیم کے اصولِ نقد ونظر سے متعلق دورِ جدید میں سیرت نگاروں کے مختلف رویے سامنے آئے، یہ مختصر سا بیان تمام رویوں کا احاطہ اور ان پر کسی مفصل تجزیے یا تبصرے کا متحمل تو نہیں، تاہم ایک جھلک کے طور پر ان میں سے چیدہ چیدہ رویوں کو اختصار کے ساتھ درج کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلا رویہ: متقدمین کے اصولِ روایت ودرایت کو بہ جا تسلیم کر کے، تمام روایاتِ سیرت پر ان کا اجرا۔

دورِ جدید کے بیشتر سیرت نگار اسی مکتبِ خیال سے تعلق رکھتے ہیں، البتہ اصولِ روایت ودرایت کی تطبیق کے انداز کچھ مختلف ہوئے ہیں، بعض حضرات نے اس حد تک تشدد سے کام لیا کہ احادیثِ احکام اور روایاتِ سیرت میں کسی قسم کا فرق نہ کیا، حتیٰ کہ روایاتِ سیرت کو احادیثِ احکام کی کسوٹی پر پرکھا، مثلاً صحیح السیرۃ النبویۃ المسماۃ السیرۃ الذہبیۃ کے مؤلف شیخ محمد بن رزق بن طرہونی اپنے منہج تالیف میں بیان

فرماتے ہیں:

على الرغم من المنهج المعروف عند اهل العلم فى التساهل فى الروايات التى تتعلق بالمغازى والفضائل والرقائق والزهد ونحوها، فإننى لم اسر على هذا المنهج، بل اعامل الروايات فى هذا المضمار معاملة الاحكام، فاسلك فيها طريقة اهل العلم فى الحكم على روايات الاحكام (۷۴)

جب کہ بعض حضرات نے یہ عندیہ دیا کہ متنِ روایت اصولِ عامہ کی روشنی میں قابلِ قبول ہو تو، نقدِ سند میں تساہل سے کام لیا جا سکتا ہے، اگر چہ ناقدینِ حدیث کے ہاں اس کی سند کو واہی ہی کیوں نہ کہا گیا ہو، بل کہ اس کے مقابلہ میں بسندِ صحیح مروی احادیث سے بھی صرفِ نظر کر لیا جائے، مثلاً فقہ السیرۃ کے مؤلف شیخ محمد غزالی اپنا منہج تحریر فرماتے ہیں:

آثرت هذا المنهج فى كتابة السيرة، فقبلت الاثر الذى يستقيم متنه مع ما صح من قواعد واحكام، وإن وهى سنده، واعرضت عن احاديث اخرى توصف بالصحة، لانها فى فهمى لدين الله، وسياسةالدعوة لم تنسجم مع السياق العام (۷۵).

جب کہ ان میں ایسے اعتدال پسند لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے متقدمین کے نقشِ قدم کی پیروی کی مکمل اور کامیاب کوشش کی، اصولی اور بنیادی مضامین صحیح احادیث کی روشنی میں طے کیے، پھر درمیانی خلاء پُر کرنے کے لئے ناقدینِ حدیث کے معیاروں کے تحت رہ کر ''واہی'' و ''موضوع'' کے علاوہ دیگر اقسامِ ضعیف سے بھی فائدہ اٹھایا، جن اقسامِ حدیث کو متقدمین نے جو درجہ دیا انہوں نے بھی وہی درجہ دیا، اس موقع پر مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری صاحب کی اصح السیر اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرۃ المصطفیٰ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جو بلاشبہ دورِ جدید میں اعتدال کے ساتھ متقدمین کے اصولِ نقد ونظر کے تحت لکھی گئی دو مثالی کتابیں ہیں، دونوں میں روایاتِ سیرت کا حسنِ انتخاب، اور ان پر اصولِ نقد ونظر کی روشنی میں کلام، کے بعد کسی نتیجے تک رسائی کی کوشش ہے، اور مجموعی حیثیت سے منہج قابلِ تحسین ہے، چناں چہ اول الذکر کے بارے میں مولانا حسن مثنیٰ ندوی کا مختصر وقابلِ قدر تبصرہ یہ ہے:

یہ کتاب مولانا عبدالرؤف قادری دانا پوری کی تالیف ہے، مولانا عالم اور مؤرخ ہیں، جا بہ جا معتدل انداز کی تحقیق وتشریح سے کام لیتے ہیں، اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں۔ (۷۶)

جب کہ ثانی الذکر کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا تبصرہ ایک بڑی علمی سند ہے:

سیر کے جتنے حقوق ولوازم ہیں، ماشاء اللہ ان کو خاص طور پر پورا کیا گیا ہے..... کتاب کا عنوان اور معنون ایسا دل کش اور اس کا مصداق ہے:

زفرق تا بہ قدم، ہرکجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جا است (۷۷)

ویسے تو ان دونوں کتابوں کا ہر ہر لفظ پڑھنے کے لائق ہے، تاہم بہ طورِ مثال چند لائق ملاحظہ مواقع یہ ہیں:

بحث وفدِ بنی المنتفق، از اصح السیر: ص۴۵۲ تا ۴۵۴

خطبۂ غدیر خم اور مسئلۂ امامت ایضاً: ص۴۹۵ تا ۵۰۰۔

حدیثِ خوخہ ایضاً: ص۵۱۷ تا ۵۱۹۔

کسریٰ کے محل کے کنگروں کا گرنا از سیرت المصطفیٰ ج۱، ص۵۵ تا ۶۱

قصۂ بحیرا راہب ایضاً ج۱، ص۸۸ تا ۹۳۔

تحقیق وتوثیق قصۂ میسرہ، ایضاً: ج۱، ص۱۰۲ تا ۱۰۷

۲۔ دوسرا رویہ: بعض صاحبِ طرز سیرت نگاروں نے متقدمین کے اصولِ روایت ودرایت سے جزوی اختلاف کیا، لیکن زیادہ امور میں ان ہی کی پیروی کی، مثلاً علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ کے مقدمے میں ناقدینِ حدیث کے روایتی ودرایتی معیار پر تفصیل سے بحث کرنے کے بعد ان میں جزوی ترامیم واضافے ضروری سمجھے ہیں۔ (۷۸)

۳۔ تیسرا رویہ: قدیم وجدید طرزِ فکر کے امتزاج کے حامل بعض سیرت نگاروں نے محدثین کے اصولِ روایت ودرایت کے ساتھ ساتھ مغربی ناقدین کے اصولِ نقد ونظر کو بھی پیشِ نظر رکھ کر بہتر نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی، مثلاً ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ کے مقدمے میں ناقدینِ حدیث اور مغربی ناقدین کے اصولِ نقد ونظر کا جائزہ لینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

إن الجمع بين معطيات منهج المحدثين ومنهج النقد الغربي يعطي امثل النتائج إذا حكمت الاخير معايير التصور الاسلامي (۷۹)

۴۔ چوتھا رویہ: بعض حضرات نے صرف ان احادیث کی روشنی میں سیرت مرتب کرنے کی کوشش کی جو صحت کی کڑی شرائط پر پورا اترتی ہیں، ظاہر ہے اس طرزِ نگارش سے یہ فائدہ تو ہوا کہ سیرت سے

متعلق کڑی شرائط پر پورا اترنے والا مواد سامنے آگیا، لیکن ایک روایت کو دوسری سے مربوط کرنے کا مسالہ کڑی شرائط کے مطابق نہ ملنے کی وجہ سے ان ہیں بھی اپنی شرائط میں نرمی کرنی پڑی، مثلاً شیخ ابراہیم العلی صحیح السیرۃ النبویۃ کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

لذلك فقد اعتمدت هذه الدراسة على اصح الروايات، ومصنفات الحديث تحتوى على ثروة كبيرة من الاحاديث الصحيحة تكون عند قارئها صورة كاملة من سيرة النبى ﷺ، لذلك اقدم الرواية الموجودة فى كتب الحديث على الرواية الموجودة فى كتب المغازى والسير وما فى الصحيح اصح (۸۰)

۵۔ پانچواں رویہ: بعض حضرات نے ایک طرف سے مغربی تنقید اور دوسری طرف سے حدیث کے اصولِ نقد ونظر کی پیچیدگیوں سے گھبرا کر صرف قرآنِ کریم کو روایاتِ سیرت کے پرکھنے کی کسوٹی قرار دیا، جو اس کے مطابق نظر آیا اسے قبول کرلیا، جو اس کے مخالف محسوس ہوا، اسے رد کردیا، مثلاً محمد حسین ہیکل (متوفی ۱۹۵۶ء) اپنی مشہورِ زمانہ کتاب حیاۃ محمد کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

فهذه المصادر، وفى مقدمتها القرآن، هى اول من تحدث عن حياة النبى العربى، فلاجرم ان تكون العمدة والاساس لكل من يريد ان يكتب سيرته باسلوب العصر وطريقته.... كما جعلتها عمدتى فى بحثى (۸۱)

مزید تحریر فرماتے ہیں:

وفى مقدمة ما يجب علينا من ذلك، خدمة للحقيقة وللانسان ية، ان نتعمق فى دراسة سيرة النبى العربى تعمقا يهدى الانسان ية طريقها إلى الحضارة التى تنشدها، والقرآن اصدق مرجع لهذه الدراسة، فهو الكتاب الذى لا ياتيه الباطل ولا تعلق به الريبة..... فكل ما تعلق بسيرة محمد يجب ان يعرض على القرآن، فما وافقه كان حقا، ومالم يوافقه لم يكن بحق، وقد حاولت من ذلك فى هذا البحث جهد طاقتى الخ (۸۲)

دورِ جدید کی سیرت نگاری اور مقبول ترین رویہ

جب عیاں ہے کہ جواہرِ سیرت کے اصل نقاد اور جوہری، محدثینِ کرام ہیں، جنہوں نے سال

ہاسال کی محنت سے نقد ونظر کی کسوٹی کو انتہائی مضبوط و مستحکم اور اپنے اصولِ نقد کو ہر پہلو سے اتنا متوسط اور معتدل بنا رکھا ہے کہ ان سے جزوی اختلاف تو ممکن ہے، لیکن ان کو یک سر نظر انداز کرنا، یا ان کے بالمقابل نئے اصول طے کرنا، یا مغربی ناقدین کے اصولوں کو ان پر ترجیح دینا بڑی علمی غلطی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امتِ وسط بنایا، اسے متوسط اور معتدل طرزِ فکر اور احکام دیئے، یہ اعتدال ہی اس کی بنیادی خوبی ٹھہرا، علم کا میدان ہو یا عمل کا، دینی معاملات ہوں یا دنیوی، ملتِ اسلام نے ہمیشہ معتدل ومتوسط درجے کو خیر الامور سمجھا، اسلامی علوم پر صدیاں بیت گئیں، اس دوران ہر فن میں ہر مزاج کے صاحبِ علم ہوئے، ہر متخصص نے مختلف طرزِ نگارش کے تحت اپنے اختصاصی علم وفن کی خدمت انجام دی، تاہم آپ کسی بھی علم وفن کے ماہرین پر نگاہ ڈالئے! جو صاحبِ فن جتنا معتدل ہوا، قبولِ عام بھی اسے اتنا ہی ملا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ دورِ جدید کی سیرت نگاری کے درجِ بالا رویوں میں سے اول الذکر رویہ سب سے معتدل ہونے کی بنا پر سب سے اہم اور دیگر رویوں کے بہ نسبت زیادہ قابلِ قبول ہے۔ پھر اس مکتبِ خیال سے تعلق رکھنے والے حضرات میں سے جو بھی معتدل ناقدینِ حدیث کے منہج نقد ونظر کو جتنا گہرائی سے سمجھا، اس نے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی جتنی کوشش کی، وہ اتنا ہی محتاط رہا، اور اس کا انداز اتنا ہی قابلِ قبول رہا، اور جس نے جس قدر عام روش سے ہٹ کر حد سے زیادہ نرمی یا بے جا سختی کا طرز اختیار کیا، وہ جادۂ مستقیم سے اتنا ہی دور ہو گیا۔

الغرض دورِ جدید کے سیرت نگاروں کے ان رویوں میں سے مقبول ترین رویہ یہ ہے کہ دورِ قدیم کے تمام اصولِ روایت ودرایت کے تحت رہ کر نقد ونظر کیا جائے، اگر اس واقعے سے کسی شرعی مسئلے کا اثبات مقصود نہ ہو، تو اس میں ناقدینِ حدیث کی شرائط کے تحت حدیثِ ضعیف کی تمام اقسام قبول کی جائیں، تاہم اگر کسی واقعۂ سیرت سے کسی شرعی حکم کا اثبات مقصود ہو تو اس میں ان قواعد واصول کے تحت نقد ونظر ہو، جو ناقدینِ حدیث کے ہاں احادیثِ احکام کی چھان پھٹک کے لئے ضروری ہیں، محض اس بنا پر کہ اس واقعہ کو ارباب سیر نے ہی بیان کیا ہے، احادیثِ احکام کے تحت اس کا ذکر نہیں ہوا، اس سے استدلال منع نہیں کیا جا سکتا، چناں چہ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ہاں! اگر کوئی شخص ان سے عقیدہ یا عمل کا مسئلہ ثابت کرنا چاہے، تو روایت وراوی کی محدثانہ تنقید وتحقیق اس کی اپنی ذمے داری ہے، وہ ائمۂ فن اس سے بری ہیں۔ علمائے محققین نے اس کو پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ عقائد واعمالِ شرعیہ کے معاملے میں تاریخی روایات جو عموماً صحیح وسقیم، معتبر وغیر معتبر کا مخلوط مجموعہ ہوتی ہیں، ان کو نہ کسی مسئلے کی

سند میں پیش کیا جا سکتا ہے، نہ بلا تحقیقِ محدثانہ ان سے استدلال کر کے کوئی مسئلۂ شرعیہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ (۸۳)

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں سیرت کو سمجھنے، پرکھنے، اور اس پر کاربند عمل ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

حواشی وحوالہ جات

۱۔ دورِ جدید کی سیرت نگاری پر ان مغربی ناقدین کی تنقید کے متعدد اثرات ہیں، تاہم ان میں سے ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ بیدار خیال اہلِ علم کے حلقے میں اپنے ذخیرے پر از سرِ نو غور وفکر کی ریت پڑ گئی، دفاع سے پہلے اس بات پر غور ہونے لگا کہ زیرِ تنقید بات کی دینی، علمی اور استنادی حیثیت کیا ہے؟ یہ واقعتاً سیرت طیبہ کا حصہ بھی ہے یا نہیں؟ چناں چہ اس تاثر کے تحت نقد ونظر کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ جس میں سیرت کے ان جزئی واقعات کا بھی مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینے اور باریک بینی سے دیکھنے کا موقع ملا، جو اس سے قبل عوام کے ہاں نوکِ زباں اور خواص کے ہاں نوکِ قلم تھے، نتیجتاً سیرت میں خاصی گراں قدر تحقیقی وتنقیدی خدمات سامنے آئیں۔

۲۔ السخاوی، محمد بن عبدالرحمٰن، شمس الدین الحافظ (المتوفی ۹۰۲ھ)۔ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ۔ تحقیق وتعلیق بالانگلیزیہ فرانز روشال۔ ترجمۃ التعلیقات بالعربیۃ ونشر الدکتور۔ صالح احمد العلی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ص ۵۰

محمد شفیع، مولانا (متوفی ۱۹۷۶ء)۔ مقامِ صحابہ۔ نشر مکتبہ معارف القرآن کراچی، طبع جدید ۱۴۳۰ھ: ص ۱۳

۳۔ مقامِ صحابہ: ص ۱۷، بتغییر یسیر

۴۔ حوالۂ بالا: ص ۱۸، بتغییر یسیر

۵۔ الطنطاوی، علی۔ مقدمۃ قصص من التاریخ۔ المکتب الاسلامی۔ الطبعۃ الثانیۃ: ص ۷ تا ۱۴

الشیخ، عبدالستار۔ مقدمۃ اعلام الحفاظ والمحدثین عبر اربعۃ عشر قرنا۔ دار القلم دمشق۔ دار الشامیۃ بیروت: ج ۱ ص ۹۵

۶۔ گیلانی، مناظر احسن، علامہ سید (المتوفی ۱۹۵۶ء)۔ تدوین الحدیث۔ تعریب ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر۔ مراجعۃ وتخریج ڈاکٹر بشار عواد معروف۔ دار الغرب الاسلامی بیروت۔ الطبعۃ الاولی ۲۰۰۴ء: ص ۲۸ تا ۳۱

محمد شفیع، مولانا مفتی اعظم۔ مقامِ صحابہ: ص ۱۴

مبارک پوری، مولانا قاضی اطہر۔ تدوینِ سیر ومغازی۔ نشر شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند: ص ۱۵

۷۔ البوطی، محمد سعید رمضان۔ فقہ السیرۃ۔ دار الفکر بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۰۰ھ: ص ۱۸

۸۔ البخاری، محمد بن اسماعیل (المتوفی ۲۵۶ھ)۔ الجامع الصحیح۔ المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ بولاق، مصر، الطبعۃ الاولی

۱۳۱۲ھ: ج ۲، ص ۸۰، وغیرہ کتبِ حدیث

السیوطی، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، جلال الدین ابو الفضل الشافعی (المتوفی ۹۱۱ھ)۔ الجامع الصغیر مع فیض القدیر للمناوی۔ دار المعرفۃ بیروت، الطبعۃ الثانیۃ تصویر الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۱ھ: ج ۶، ص ۲۱۴ تا ۲۱۵

۹۔ ندوی، سید سلیمانؒ، علامہ (متوفی ۱۹۵۳ء)۔ سیرت النبی۔ مطبع معارف، اعظم گڑھ (انڈیا)، طبع دوم، سن ۱۹۲۸ء: ج ۳ ص ۶۶۳

۱۰۔ مقامِ صحابہ: ص ۲۲

تدوین الحدیث: ص ۳۸

۱۱۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ مقدمہ اصح السیر فی ہدی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم۔ مجلس نشریاتِ اسلام کراچی۔ ۱۹۸۱ء: ص ۴

۱۲۔ معروف شارحِ حدیث امام نوویؒ (متوفی ۶۷۶ھ) اس طرح رقم طراز ہیں:

فرق فی تحریم الکذب علیه صلی اللّٰه علیه و سلم بین ما کان فی الاحکام وما لا حکم فیه کالترغیب والترهیب والمواعظ وغیر ذلك فکله حرام من اکبر الکبائر واقبح القبائح باجماع المسلمین الذین یعتد بهم فی الاجماع (النووی، یحییٰ بن شرف، محی الدین ابو زکریا الامام الحافظ (المتوفی ۶۷۶ھ)۔ المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج۔ المطبعۃ المصریۃ بالازہر، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۴۷ھ: ج ۱، ص ۷۰)

دیگر شراحِ حدیث اور محققین سیرت نگاروں نے بھی حدیث کے اس عموم کی تصریح کی ہے، جن میں سے چند حوالے حسبِ ذیل ہیں:

العینی، محمود بن احمد، ابو محمد بدرالدین (المتوفی ۸۵۵ھ)۔ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری۔ ضبط وتصحیح عبداللہ محمود محمد عمر۔ دار الکتب العلمیۃ بیروت، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۲۱ھ: ج ۲، ص ۲۲۴۔ کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی

المناوی، محمد عبدالرؤوف، زین الدین الحدادی (المتوفی ۱۰۳۱ھ)۔ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر۔ دار المعرفۃ بیروت، الطبعۃ الثانیۃ تصویر الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۹۱ھ: ج ۶، ص ۲۱۴، رقم الحدیث: ۸۹۹۳۔

الارنؤوط، شعیب، والارنؤوط، عبدالقادر۔ مقدمۃ التحقیق۔ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد۔ تالیف ابن القیم، محمد بن ابی بکر، شمس الدین ابو عبداللہ الامام المحدث (المتوفی ۷۵۱ھ)۔ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، الطبعۃ السابعۃ والعشرون: ج ۱، ص ۱۰ و ۱۱

۱۳۔ اصح السیر: ص ۸

غضبان، منیر محمد، فقہ السیرۃ النبویۃ۔ مرکز البحوث العلمیۃ واحیاء التراث الاسلامی، جامعۃ ام القریٰ مکۃ

المکرمۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۹ھ: ص ۱۳

۱۴۔ عتر، نورالدین الدکتور۔ منہج النقد فی علوم الحدیث۔ دارالفکر سوریۃ، تصویر الطبعۃ الثالثۃ سنۃ ۱۴۰۸: ص ۲۷

جب کہ علامہ طاہر الجزائری (متوفی ۱۳۳۸ھ) اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

وذهب بعض العلماء إلى إدخال كل ما يضاف إلى النبى عليه الصلاة و السلام فى الحديث فقال فى تعريفه: علم الحديث اقوال النبى عليه الصلاة و السلام وافعاله واحواله، وهذا التعريف هو المشهور عند علماء الحديث وهو الموافق لفنهم فيدخل فى ذلك اكثر ما يذكر فى كتب السيرة كوقت ميلاده عليه الصلاة و السلام ومكانه ونحو ذلك (الجزائری، طاہر بن محمد صالح، الشیخ العلامۃ الدمشقی (المتوفی ۱۳۳۸ھ)۔ توجیہ النظر الی اصول اہل الاثر، اعتنی بہ الشیخ عبدالفتاح ابوغدۃ۔ نشر مکتب المطبوعات الاسلامیۃ حلب، تصویر الطبعۃ الاولی فی بیروت ۱۴۱۶ھ: ج ۱، ص ۳۷)

علامہ محمد بن جعفر کتانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۴۵ھ) کا فرمانا ہے:

واعلم ان علم الحديث لدى من يقول: إنه اعم من السنة هو: العلم المشتمل على نقل ما اضيف إلى النبى صلى الله عليه وسلم، او إلى صحابى، او إلى من دونه من الاقوال والافعال والتقارير والاحوال والسير و الايام حتى الحركات و السكنات فى اليقظة و المنام واسانيد ذلك وروايته وضبطه وتحرير الفاظه، وشرح معانيه (الکتانی، محمد بن جعفر، السید العلامۃ (المتوفی ۱۳۴۵ھ)۔ الرسالۃ المستطرفۃ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ، تقدیم محمد المنتصر بن محمد الزمزمی الکتانی۔ دارالبشائر الاسلامیۃ بیروت، الطبعۃ الخامسۃ ۱۴۱۴ھ: ص ۳۔ تعریف علم الحدیث)

ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد نے درج ذیل الفاظ میں اس کا اعتراف کیا:

ممالاشك فيه ان معظم اصل مادة كتب المغازى والسير، هى مرويات مبثوثة فى كتب السنة، حتى ان المحدثين عند ما عرفوا السنة، جعلوا السيرة جزا منها، فقالوا: إنها كل ما اثر عن الرسول صلى الله عليه وسلم من قول او فعل او تقرير اوصفة خلقيه او خلقية او سيرة (مہدی، رزق اللہ احمد، الدکتور۔ السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الاصلیۃ۔ مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیۃ، الریاض، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۲ھ: ص ۲۰)

۱۵۔ الحاکم، محمد بن عبداللہ، الحافظ ابوعبداللہ النیسابوری (المتوفی ۴۰۵ھ)۔ معرفۃ علوم الحدیث۔ تصحیح وتعلیق ڈاکٹر سید معظم حسین۔ المکتبۃ العلمیۃ المدینۃ المنورۃ۔ الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۹۷ھ تصویر طبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ،

حیدر آباد الدکن: ص ۲۳۸۔ والمطبوع باسم معرفۃ علوم الحدیث وکمیۃ اجناسہ۔ شرح وتحقیق احمد بن فارس سلوم۔ دار ابن حزم، بیروت، الطبعۃ الاولی ۱۴۲۴ھ: ص ۲۳۶

الخطیب، احمد بن علی بن ثابت، ابوبکر البغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ)۔ شرف اصحاب الحدیث ونصیحۃ اہل الحدیث۔ تحقیق وتخریج عمرو عبدالمنعم سلیم۔ نشر مکتبۃ ابن تیمیۃ، القاہرۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۷ھ: ص ۲۶

الجزائری، طاہر الدمشقی (المتوفی ۱۳۳۸ھ)، توجیہ النظر الی اصول اہل العصر: ص ۴۶۵

تدوین سیر ومغازی: ص ۱۵

۱۶۔ القنوجی، صدیق حسن خان، السید ابو الطیب (المتوفی ۱۳۰۷ھ)۔ الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ، دراسۃ علی حسن الحلبی۔ دار الجیل بیروت، دون تاریخ: ص ۱۱۸ و ۱۲۰

کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا (متوفی ۱۹۷۶ء)۔ سیرت المصطفیٰ، فرید بک ڈپو دہلی، اشاعت ۱۹۹۹ء: ج ۱، ص ۳

۱۷۔ الدہلوی، عبدالعزیز بن الامام ولی اللہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ)۔ بستان المحدثین۔ تعریب الدکتور محمد اکرم الندوی، تقدیم العلامۃ السید ابوالحسن علی الندوی۔ طبعۃ دار الغرب الاسلامی بیروت، ص ۱۷۳، وص ۱۸۱۔ اس میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے عمل الیوم واللیلۃ اور الشفاء وغیرہ کو بیان کیا ہے۔

الکتانی، محمد بن جعفر (المتوفی ۱۳۴۵ھ)۔ الرسالۃ المستطرفۃ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ: ص ۱۰۵ تا ص ۱۱۰۔ اس موقع پر علامہ کتانی رحمہ اللہ نے سیر ومغازی کی ۲۹ کتابوں کو کتب حدیث میں شمار کیا ہے، اور ص ۱۹۷ تا ۲۰۳، سیرت وخصائص کی مزید ۳۳ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

'اردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں سیرت کے موضوع پر مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں:

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل واخلاق وعادات سے متعلق احادیث ہی کو سیرت کہتے ہیں (مرتبہ زیر اہتمام دانش گاہ، پنجاب لاہور، طبع اول، ۱۹۷۵ء: ج ۱۱، ص ۵۰۶)

ہر چند کہ اس مقالے کا بیشتر مواد اور یہ بات بھی مولانا شبلی نعمانی کے مقدمۂ سیرت النبی سے ماخوذ ہے، جن کے سیرت اور حدیث کے مابین تفریق کے نظریہ کا جائزہ مع مالہ وماعلیہ آگے آرہا ہے، تاہم اس بات کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مذکورہ مقالہ نگار کے ہاں شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ اور علامہ محمد بن جعفر کتانی جیسے محدثین کا کتب شمائل واخلاق نبوی وغیرہ کو اور کتب سیرت کو کتب حدیث میں شمار کرنا قابل تسلیم نہیں، تو کوئی بات نہیں، لیکن خود مولانا شبلی نعمانی نے امام ترمذی رحمہ اللہ کی شمائل کو نہ صرف کتب سیرت میں شمار کیا ہے، بل کہ اسی کی وجہ سے امام ترمذی رحمہ اللہ کو سیرت نگاروں کی فہرست میں جگہ بھی دی ہے، موصوف تحریر فرماتے ہیں:

محمد بن عیسیٰ ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ) مشہور محدث ہیں، سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے، جس کا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام ''کتاب الشمائل'' ہے، جس میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات وعادات واخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روائتیں معتبر اور صحیح ہوں۔ (مقدمۂ سیرت النبی ﷺ۔ ناشر دینی کتب خانہ اردو بازار لاہور، طبع چہارم ۱۹۷۵ء: ج ۱، ص ۶۰)

لہٰذا مولانا شبلی نعمانی کا اسے کتبِ سیرت میں شمار کرنا ہی اس بات کی تردید کے لئے کافی ہے۔

۱۸۔ الخطیب، احمد بن علی، الحافظ ابوبکر البغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ)۔ الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع۔ تقدیم وتحقیق الدکتور محمد عجاج الخطیب، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت: ج ۲، ص ۲۸۷

۱۹۔ ندوی، سید سلیمانؒ، علامہ (متوفی ۱۹۵۳ء)۔ خطباتِ مدراس۔ مکتبہ اسلامیہ لاہور، سن ۲۰۱۰ء: ص ۵۳ تا ۶۵

حمید اللہ، الدکتور محمد۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ۔ دار النفائس بیروت، الطبعۃ السادسۃ ۱۴۰۷ھ: ص ۴۱ تا ۳۶۰

الکتانی، محمد عبدالحیٔ، العلامۃ المحدث الفاسی (المتوفی ۱۳۸۲ھ)۔ نظام الحکومۃ النبویۃ المسمی التراتیب الاداریۃ۔ تحقیق الدکتور عبداللہ الخالدی۔ دار الارقم بیروت، الطبعۃ الثانیۃ بدون تاریخ: ج ۱، ص ۱۵۴ تا ۱۶۸

داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ اصح السیر: ص ۱۱ تا ۱۳

احمد عبدالغفار، السید الدکتور۔ دراسات فی الحدیث الشریف۔ نشر دار المعرفۃ الجامعیۃ، الاسکندریۃ، سن ۲۰۰۰ء: ص ۱۷ تا ۲۰

۲۰۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود جو کفارِ مکہ کی جانب سے مذاکرات کے لئے آئے، انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی آں حضرت ﷺ سے والہانہ محبت کے جو مناظر دیکھے، ان ہیں ان الفاظ میں جا کر کفارِ مکہ کو سنایا:

ای قوم واللہ لقد وفدت علی الملوك ووفدت علی قیصر وکسری والنجاشی واللہ إن رایت ملکا قط یعظمہ اصحابہ ما یعظم اصحاب محمد ﷺ محمدا، واللہ إن تنخم نخامۃ إلا وقعت فی کف رجل منھم فدلك بھا وجھہ وجلدہ، وإذا امرھم ابتدروا امرہ، وإذا توضا کادوا یقتتلون علی وضوئہ، وإذا تکلم خفضوا اصواتھم عندہ، وما یحدون إلیہ النظر تعظیما لہ (البخاری، محمد بن اسماعیل، الامام (المتوفی ۲۵۶ھ)۔ الجامع الصحیح: ج ۳، ص ۱۹۴)

۲۱۔ کتبِ حدیث کی مراجعت کرنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے فیض یافتگان کو جیسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال، احکام وشرائع اور اوامر ونواہی سکھائے، ویسے ہی آپ ﷺ کے اوصافِ خَلقی وخُلقی بھی بتائے، بل کہ ان حضرات کے ہاں تو آپ کی سیرت سے متعلقہ امور کی یہ اہمیت تھی:

علی بن الحسین یقول: کنا نعلم مغازی النبی ﷺ وسرایاہ کما نعلم السورۃ من

القرآن (الخطیب، احمد بن علی، الحافظ ابوبکر البغدادی (التوفی ۴۶۳ھ)۔ الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع: ج ۲، ص ۲۸۷)

ان کے لئے آپ ﷺ سے متعلق ہر ہر چیز یکساں اہمیت کی حامل، اور ہر ہر نشست و برخاست لائق توجہ تھی، بہ طورِ مثال شمائل ترمذی میں آپ ﷺ کے حلیہ کے بیان پر مشتمل حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ملاحظہ فرمایئے:

الحسن بن علی رضی اللّٰہ عنہما قال: سالت خالی ھند بن ابی ھالة وکان وصافا عن حلیة النبی ﷺ، وانا اشتھی ان یصف لی منھا شیئا اتعلق به، فقال: کان رسول اللّٰہ ﷺ فخما مفخما یتلالا وجھه تلالؤ القمر لیلة البدر....الخ (الترمذی، محمد بن عیسیٰ، الامام الحافظ ابوعیسیٰ (التوفی ۲۷۹ھ)۔ الشمائل المحمدیۃ والخصائل المصطفویۃ۔ تحقیق سید بن عباس الجلیمی۔ المکتبۃ التجاریۃ مصطفیٰ احمد الباز مکۃ المکرمۃ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۳ھ: ص ۳۵)

غور کیجئے! آں حضرت ﷺ کی ظاہری شخصیت اور جسمانی خط وخال کو کس تفصیل اور محبت کے ساتھ محفوظ رکھا اور بیان کیا، حتیٰ کہ یہ ہی بات ان کی خصوصیت اور وجۂ شہرت قرار پائی، صغار صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم میں ان کے اس حسنِ بیان یا بیانِ حسن کے چرچے تھے، اور وہ بے ساختہ اسے سننے چلے آتے تھے، اوروں کو تو چھوڑیئے، نواسۂ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ باوجودے کہ آپ کی گود میں ہی پلے بڑھے، کھیلے کودے، دوشِ مبارک پر سوار ہوتے رہے، اور آپ کی ہر ہر خوبی اور ادا کو انتہائی قریب سے دیکھ چکے تھے، ان کی زبانی یہ حلیۂ مبارکہ سننے، اور اس کو دل سے لگا کر رکھنے کا کیسا والہانہ اشتیاق رکھتے تھے، یہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔

یہ ہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جب احادیثِ احکام بھی بیان کرتے تو اس میں حسبِ موقع آں حضرت ﷺ کی سیرت سے متعلق وہ باتیں بھی بیان کر جاتے، جن کا بظاہر ان احکام سے کوئی تعلق نہ ہوتا، بہ طورِ مثال صحیح مسلم میں چشم وچراغ خاندانِ نبوت حضرت ابوجعفر محمد بن علی باقر رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آں حضرت ﷺ کے حج سے متعلق استفسار، اور ان کے جواب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ملاحظہ فرمایئے:

دخلنا علی جابر بن عبد اللّٰہ، فسال عن القوم حتی انتھی إلی، فقلت: انا محمد بن علی بن حسین، فاھوی بیدہ إلی راسی..... فقال: مرحبا بك یا ابن اخی، سل عما شئت! فسالته وھو اعمی .....فقلت: اخبرنی عن حجة رسول اللّٰہ ﷺ (النیسابوری، مسلم بن الحجاج، الامام الحافظ ابوالحسین القشیری (التوفی ۲۶۱ھ)۔ الصحیح، اعتناء ابی

صہیب الکرمی۔ بیت الافکار الدولیۃ الریاض، ۱۴۱۹ھ: ص ۴۸۳ تا ۴۸۵، حدیث: ۱۲۱۸)

اس حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حج اور اس سے متعلقہ احکام کے ساتھ ساتھ ان ایام میں آپ ﷺ کے معمولات اور نشست و برخاست بھی بیان کئے ہیں، کتبِ حدیث میں اس کی مثالیں تلاش کئے بنا بھی جا بہ جا ملتی ہیں، نیز صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہر قسم کی احادیث سے اعتنا و اہتمام سے متعلق درج ذیل حوالہ جات بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں:

الرازی، عبد الرحمٰن بن ابی حاتم محمد بن ادریس، ابو محمد الامام الحافظ (المتوفی ۳۲۷ھ)۔ تقدمۃ کتاب الجرح والتعدیل۔ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد الدکن، الطبعۃ الاولی ۱۳۷۱ھ: ج ۱، ق ۱، ص ۷ و ۸

الشیخ، عبد الستار۔ اعلام الحفاظ والمحدثین: ج ۱، ص ۱۱، وایضاً: ج ۱، ص ۱۰۳ و ۱۰۴

۲۲۔ امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۶ھ) کی طرف اشارہ ہے کہ بہت سے حضرات نے علم حدیث کی تدوین کو ان ہی کا کارنامہ قرار دیا ہے (الکتانی، محمد بن جعفر، (المتوفی ۱۳۴۵ھ)۔ الرسالۃ المستطرفۃ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ: ص ۴)، جب کہ سیرت کے اوّلین مدوّنین میں بھی ان کا نام لیا جاتا ہے (داناپوری، عبد الرؤف، مولانا حکیم ابو البرکات قادری۔ اصح السیر: ص ۱۳۔ ومبارک پوری، مولانا قاضی اطہر۔ تدوین سیر و مغازی: ص ۱۷۲ و ۱۷۳۔ وندوی، عبد اللہ عباس، مولانا۔ تاریخ تدوین سیرت۔ اشاعت دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد (انڈیا) بار اول ۱۴۳۴ھ: ص ۲۸ وغیرہ)

۲۳۔ داناپوری، عبد الرؤف، مولانا حکیم ابو البرکات قادری: اصح السیر: ص ۱۳

۲۴۔ الحاکم، محمد بن عبد اللہ، الحافظ ابو عبد اللہ النیسابوری (المتوفی ۴۰۵ھ)۔ معرفۃ علوم الحدیث۔ تصحیح وتعلیق ڈاکٹر سید معظم حسین: ص ۱۱۲

۲۵۔ الشیخ، عبد الستار۔ مقدمہ اعلام الحفاظ والمحدثین: ج ۱، ص ۶۰

۲۶۔ محمد شفیع، مولانا مفتی۔ مقامِ صحابہ: ص ۱۴ و ۱۵

۲۷۔ بہ طورِ مثال ہی سہی، دورِ قدیم کے چند نامور سیرت نگاروں کے حوالہ جات بھی درج ذیل ہیں:

الکلاعی، سلیمان بن موسیٰ، الامام ابو الربیع الاندلسی رحمہ اللہ (المتوفی ۶۳۴ھ)۔ الاکتفاء فی مغازی رسول اللہ والثلاثۃ الخلفاء۔ تحقیق مصطفیٰ عبد الواحد۔ مکتبۃ الخانجی بالقاہرۃ، الطبعۃ الاولی ۱۳۸۷ھ: ج ۱ ص ۲ تا ۶

الصالحی، محمد بن یوسف، الشامی (۹۴۲ھ)۔ سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد۔ تحقیق الدکتور مصطفیٰ عبد الواحد۔ لجنۃ احیاء التراث الاسلامی، وزارۃ الاوقاف جمہوریۃ مصر العربیۃ، ۱۴۱۸ھ: ج ۱، ص ۱ تا ۶

ابن الدیبع، عبد الرحمٰن بن علی بن محمد، وجیہ الدین الشافعی (المتوفی ۹۴۴ھ)۔ حدائق الانوار ومطالع الاسرار فی سیرۃ النبی المختار۔ تحقیق عبد اللہ ابراہیم الانصاری۔ المکتبۃ المکیۃ السعودیۃ، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۱۳ھ: ج ۱، ص ۹

الحلبی، علی بن برہان الدین الشافعی (المتوفی ۱۰۴۴ھ)۔ انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون۔ المکتبۃ الاسلامیۃ بیروت، بدون تاریخ: ج۱، ص۲

۲۸۔ ندوی، سید سلیمانؒ، علامہ (متوفی ۱۹۵۳ء)۔ خطبات مدراس۔ شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ لاہور، سن اشاعت جون ۲۰۱۰ء: ص۴۹

۲۹۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ اصح السیر: ص۱۶

۳۰۔ کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا: ج۱، ص۳و۴

۳۱۔ حوالۂ بالا: ج۱، ص۸و۹

۳۲۔ محمد بن رزق اللہ بن طرہونی، الشیخ۔ صحیح السیرۃ النبویۃ المسماۃ بالسیرۃ الذہبیۃ۔ دار ابن تیمیۃ للطباعۃ والنشر القاہرۃ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۰ھ: ج۱، ص۴۳

۳۳۔ غضبان، منیر محمد۔ فقہ السیرۃ النبویۃ۔ معہد البحوث العلمیۃ واحیاء التراث الاسلامی، جامعۃ ام القریٰ مکۃ المکرمۃ، ۱۴۱۹ھ: ص۱۵

۳۴۔ حوالۂ بالا: ص۲۸و۲۹

۳۵۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ اصح السیر: ص۸

۳۶۔ المقدسی، محمد بن طاہر، الحافظ ابو الفضل القیسرانی (متوفی ۵۰۷ھ)۔ شروط الائمۃ الستۃ۔ دار الکتب العلمیۃ بیروت، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۰۵ھ: ص۲۰

القنوجی، صدیق حسن خان، السید ابوالطیب (المتوفی ۱۳۰۷ھ)۔ الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ: ص۱۲۷

الکتانی، محمد بن جعفر (المتوفی ۱۳۴۵ھ)۔ الرسالۃ المستطرفۃ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ: ص۲۰تا۲۶و۳۲

۳۷۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ اصح السیر۔ ص۹و۱۰

۳۸۔ حوالۂ بالا: ص۱۶

۳۹۔ شبلی نعمانی، علامہ (متوفی ۱۳۳۲ھ)۔ مقدمۃ سیرت النبی ﷺ۔ دینی کتب خانہ لاہور، عکسِ طبع چہارم ۱۹۷۵ء: ج۱، ص۳۷تا۴۰ حاشیہ

۴۰۔ النیسابوری، مسلم بن الحجاج، الامام الحافظ ابوالحسین القشیری (المتوفی ۲۶۱ھ)۔ مقدمۃ الصحیح، اعتناء ابی صہیب الکرمی۔ بیت الافکار الدولیۃ الریاض، ۱۴۱۹ھ: ص۳۱تا۳۳۔ نیز امام بخاری ومسلم اور دیگر ارباب صحاح کے مابین شرائطِ صحت وغیرہ کے اختلاف سے متعلق ملاحظہ فرمائیے: المقدسی، محمد بن طاہر، الحافظ ابو الفضل القیسرانی (متوفی ۵۰۷ھ)۔ شروط الائمۃ الستۃ: ص۱۷ وغیرہ

۴۱۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ اصح السیر: ص۱۱

۴۲۔ شہید کی نمازِ جنازہ کے بارے میں ائمۂ فقہاء کا اختلاف ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے شہدائے احد کی نمازِ جنازہ پڑھی تھی یا نہیں؟ اس میں صحیح بخاری اور ترمذی وغیرہ کی روایات میں نفی منقول ہے، جب کہ روایاتِ سیر میں اثبات ہے، فقہائے حنفیہ نے اس موقع پر کتبِ احادیث کے مقابل روایاتِ سیر کو ترجیح دے اس سے اس مسئلہ کا اثبات کیا ہے، حکیم عبدالرؤف داناپوری صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

شہدا کے صلاۃِ جنازہ سے متعلق اختلاف ہے، امام مالک وامام شافعی شہید پر صلاۃِ جنازہ منع کرتے ہیں، امام احمد کا دو قول ہے امام ابوحنیفہ واجب کہتے ہیں، جو لوگ منع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ نے یا خلفائے راشدین نے یا حضور کے حکام میں سے کسی نے غزوہ یا کسی موقع پر ایسے شہداء کے جنازہ کی نماز پڑھی ہو جو کہ معرکہ میں شہید ہوئے ہوں، غزوۂ احد کے متعلق حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت بخاری اور ترمذی میں موجود ہے کہ حضور ﷺ نے شہدا احد کو بلا غسل ان کے اپنے لباس میں بلا صلاۃ پڑھے ہوئے دفن کیا۔

علمائے احناف کہتے ہیں کہ تمام اصحابِ سیر لکھ رہے ہیں کہ غزوۂ احد میں حضور ﷺ نے شہدا کے جنازہ کی نماز پڑھی مانعین کہتے ہیں ان سب روایتوں میں کلام ہے، اور سب کی سند مجروح ہے، احناف کہتے ہیں ان روایتوں کی سندیں درجۂ حسن سے نازل نہیں ہیں، اور حدیث حسن قابلِ استدلال ہے، خصوصاً جب متعدد طریقہ سے اعتضاد موجود ہے۔ (اصح السیر: ص ۱۱۲ و ۱۱۳)

درجِ بالا اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ صحیحین یا کتبِ احادیث کی مرویات کی کتبِ سیرت کی روایات پر ترجیح کا یہ کلیہ جلیل القدر حنفی فقہاء کے ہاں قابلِ قبول نہیں، وہیں روایاتِ سیرت سے شرعی مسائل کے استنباط واستدلال کی اصولی حیثیت پر غور کی دعوت بھی مل رہی ہے۔

۴۳۔ لکھنوی، محمد عبدالحئی، ابوالحسنات (المتوفی ۱۳۰۴ھ)۔ الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ۔ مع التعلیقات الحافلۃ بقلم الشیخ عبدالفتاح ابی غدۃ۔ نشر کتب المطبوعات الاسلامیۃ حلب، الطبعۃ الثانیۃ، القاہرۃ ۱۴۰۴ھ: ص ۶۶ تا ۱۰۱

۴۴۔ جالندھری، خیر محمد، مولانا (متوفی)، خیر الاصول فی حدیث الرسول، مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۳۴۴ھ، ص ۹

۴۵۔ لکھنوی، محمد عبدالحئی، ابوالحسنات (المتوفی ۱۳۰۴ھ)۔ الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ۔ مع التعلیقات الحافلۃ بقلم الشیخ عبدالفتاح ابی غدۃ: ص ۶۶ تا ۱۰۱

۴۶۔ مولانا حکیم عبدالرؤف داناپوری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

الغرض محدثین کے یہاں جو صحیح روایتیں ہیں، اصحابِ سیرت کو ان کی ترجیح میں کلام نہیں ہے، لیکن ان کو اپنی ضروریات کے لئے اور روائتیں بھی لینی پڑتی ہیں، جس کے لئے وہ اپنا معیار الگ قائم کرتے

ہیں۔(اصح السیر :ص ۱۱)

۴۷۔ لکھنوی، محمد عبدالحیٔ، ابوالحسنات (المتوفی ۱۳۰۴ھ)۔الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ۔مع التعلیقات الحافلۃ بقلم الشیخ عبدالفتاح ابی غدۃ: ص ۶۶ تا ۱۰۱

۴۸۔ الحمیدی، عبدالعزیز بن عبداللہ الدکتور۔التاریخ الاسلامی مواقف وعبر۔السیرۃ النبویۃ، دارالدعوۃ الاسکندریۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۸ھ: ج ۱ ص ۲۴ تا ۲۶

۴۹۔ بل کہ علامہ شبلی نعمانی صاحب تو اپنے بیان کردہ اصول پر بھی پوری طرح کاربند نہیں رہے، چناں چہ ایمانِ ابو طالب، غزوۂ بنی مصطلق اور واقعۂ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا وغیرہ مواقع پر صحیح احادیث کو بالائے طاق رکھ کر روایاتِ سیرت کو ترجیح دی، اور متعدد مواقع پر کتبِ حدیث کے بہ جائے کتبِ سیرت پر اعتماد بھی کیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: صدیقی، ظفر احمد، ریڈر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔مقالہ: مولانا شبلی بہ حیثیت سیرت نگار۔عکس طباعت سن ۲۰۰۱: ص ۱۱۷ تا ۱۳۷ باب سوم و چہارم)

۵۰۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اسی مقدمہ میں کچھ آگے جا کر تحریر فرماتے ہیں:

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی، اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس سلسلہ کا فن ختم ہتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق۔

موسیٰ بن عقبہ خاندانِ زبیر کے غلام تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا، فنِ حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں، امام مالک ان کے نہایت مداح تھے، اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فنِ مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، ان کے مغازی کی جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں:

۱۔ مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا ہے۔

۲۔ عام مصنفین کا مذاق یہ تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتبِ مغازی کے مختصر ہے۔موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع وذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں (مقدمۃ سیرت النبی ﷺ: ج ۱، ص ۵۰)

۵۱۔ المزی، یوسف بن عبدالرحمٰن، جمال الدین ابوالحجاج (المتوفی ۷۴۲ھ)۔تہذیب الکمال فی اسماء الرجال۔تحقیق الدکتور بشار عواد معروف۔مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۰۳ھ: ج ۲۹، ص ۱۹ وما بعدہ۔

الکتانی، محمد بن جعفر (المتوفی ۱۳۴۵ھ)۔الرسالۃ المستطرفۃ لبیان۔مشہور کتب السنۃ المشرفۃ: ص ۱۰۹ و ۱۱۰

۵۲۔ ان حوالوں سے جہاں موصوف کے دعویٰ کی حقیقت ثابت ہوتی ہے، وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ

محدثین کرام کو دیگر احادیث کی طرح مغازی وسیر کی احادیث میں بھی مروی عنہ شیخ میں شرائطِ روایت کو دیکھ بھال کر اس سے حدیث سننے کا لحاظ رہتا تھا۔ تعجب ہے کہ علامہ شبلی نعمانیؒ جیسے صاحبِ نظر بیک جنبش قلم تمام متقدمین سیرت نگاروں کو عدم التزامِ صحت کا الزام دے رہے ہیں، حال آں کہ غور کرنے والوں کو متقدمین کی کتابوں میں بھی بہت سے محاسن نظر آتے ہیں، چناں چہ معروف محدث علامہ ابن الدیبع (متوفی ۹۴۴ھ) کی کتاب حدائق الانوار کے بارے میں شیخ منیر محمد غضبان تحریر کرتے ہیں:

الثانية: ماكتبه المحدث ابن الديبع الشيبانى فى السيرة وسماه حدائق الانوار ومطالع الاسرار، اعتمد اوثق الروايات واصحها فقط فى عرض السيرة النبوية، ولكنه لم يتمكن من سد الفجوات كلها فى عرض السيرة النبوية المطهرة (فقہ السیرۃ النبویۃ: ص ۱۸)

نیز ڈاکٹر فاروق حمادہ نے بھی چند متقدم کتبِ سیرت پر اپنے تبصرے میں بہ طور خاص حافظ شمس الدین ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی ''تاریخ الاسلام'' کے سیرت سے متعلق حصہ کو خاصا معتبر قرار دیا ہے (ملاحظہ فرمائیے: مصادر السیرۃ النبویۃ وتقویمہا۔ دار القلم بیروت، الطبعۃ الثالثۃ: ص ۱۵۴ تا ۱۶۷)

۵۳۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، (المتوفی ۲۵۶ھ)۔ الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق: ج ۵، ص ۱۰۷، وایضاً، باب غزوۃ بنی المصطلق: ج ۵، ص ۱۱۵، وایضاً، باب غزوۃ الطائف: ج ۵، ص ۱۵۶

۵۴۔ شبلی نعمانی، علامہ، مقدمۂ سیرت النبی ﷺ: ج ۱، ص ۲۰

۵۵۔ لکھنوی، محمد عبد الحئی، ابو الحسنات (المتوفی ۱۳۰۴ھ)۔ الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ۔ مع التعلیقات الحافلۃ بقلم الشیخ عبد الفتاح ابی غدۃ: ص ۴۰ تا ۶۵

۵۶۔ السباعی، الدکتور مصطفی (متوفی ۱۹۶۴ء)۔ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی۔ تقدیم الدکتور محمد ادیب صالح۔ المکتب الاسلامی بیروت، الطبعۃ الثانیۃ: ص ۳۰۰ ومابعدہ

۵۷۔ نصر پوری، محمد اکرم بن عبد الرحمٰن۔ العلامۃ القاضی المحدث (من اعلام القرن الحادی عشر)۔ امعان النظر فی توضیح نجبۃ الفکر۔ تحقیق الدکتور ابو سعید غلام مصطفیٰ القاسمی۔ نشر الرحیم اکادمی کراچی، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۲۹ھ: ص ۶۳

۵۸۔ محمد شفیع، مولانا مفتی اعظم۔ مقام صحابہ: ص ۱۲ و ۱۳

۵۹۔ جالندھری، خیر محمد، خیر الاصول فی حدیث الرسول: ص ۸

۶۰۔ حوالۂ بالا

۶۱۔ محمد شفیع، مولانا مفتی اعظم۔ مقام صحابہ: ص ۸

۶۲۔ العونی، حاتم بن عارف الشریف۔ اضاآت بحثیۃ فی علوم السنۃ النبویۃ۔ اعتناء ہانی بن منیر السویہری۔

دار الصمیعی الریاض، الطبعۃ الاولی ۱۴۲۸ھ: ص ۲۷۰

۶۳۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری: اصح السیر: ص ۹

۶۴۔ غضبان، منیر محمد۔ فقہ السیرۃ النبویۃ: ص ۲۸ و ۲۹

۶۵۔ الحاکم، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحافظ النیسابوری (المتوفی ۴۰۵ھ)۔ المستدرک علی الصحیحین۔ مع التعلیقات الحافظ شمس الدین الذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ)۔ تذییل ابی عبدالرحمٰن مقبل بن ہادی الوادعی۔ دار الحرمین القاہرۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۷ھ: ج ۱، ص ۶۷۱، رقم الحدیث ۱۸۵۲

۶۶۔ الخطیب، احمد بن علی بن ثابت البغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ)۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ۔ جمعیۃ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد الدکن، ۱۳۵۷ھ: ص ۱۳۳

۶۷۔ الرازی، عبدالرحمٰن بن ابی حاتم محمد بن ادریس، ابومحمد الامام الحافظ شیخ الاسلام۔ تقدمۃ کتاب الجرح والتعدیل۔ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد الدکن، الطبعۃ الاولی ۱۳۷۱ھ: ج ۱، ق ۱، ص ۷

۶۸۔ السخاوی، محمد بن عبدالرحمٰن الشافعی، شمس الدین ابوالخیر (المتوفی ۹۰۲ھ)۔ فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث۔ دراسۃ وتحقیق الدکتور عبدالکریم بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن الخضیر والدکتور محمد بن عبداللہ بن فہید آل فہید۔ دار المنہاج الریاض، الطبعۃ الاولی ۱۴۲۶ھ: ج ۲، ص ۱۵۱ و ۱۵۲

۶۹۔ ابن عبدالبر، ابی عمر یوسف بن عبداللہ النمری القرطبی (المتوفی ۴۶۳ھ)۔ جامع بیان العلم وفضلہ، تحقیق۔ ابوالاشبال الزہیری، الناشر: مؤسسۃ الریان دار ابن الجوزی المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۴ھ۔ ج ۱، ص ۱۰۴

۷۰۔ الخطیب، احمد بن علی بن ثابت البغدادی۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ: ص ۱۳۳

۷۱۔ لکھنوی، محمد عبدالحیٔ، ابو الحسنات البندی (المتوفی ۱۳۰۴ھ)۔ الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ، مع التعلیقات الحافلۃ بقلم الشیخ عبدالفتاح ابی غدۃ: ص ۳۶ تا ۶۵

۷۲۔ الحلبی، علی بن برہان الدین الشافعی (المتوفی ۱۰۴۴ھ)۔ انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون، المکتبۃ الاسلامیۃ بیروت، بدون تاریخ: ج ۱، ص ۲

۷۳۔ داناپوری، عبدالرؤف، مولانا حکیم ابوالبرکات قادری۔ اصح السیر: ص ۱۰ تا ۱۱

۷۴۔ محمد بن رزق اللہ بن طرہونی، الشیخ۔ صحیح السیرۃ النبویۃ المسماۃ بالسیرۃ الذہبیۃ۔ دار ابن تیمیۃ للطباعۃ والنشر القاہرۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۰ھ: ج ۱، ص ۱۸ و کذا فی ص ۳۷

اسی طرح دورِ جدید کے ایک نام ور محقق مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ایک مقالہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مستند روایاتِ میلاد وغیرہ کو صرف اس بنا پر معتبر جانتے ہیں کہ وہ جلیل القدر محدثین کی کتب میں مروی ہیں، اگرچہ وہ ناقدینِ حدیث کی نظر میں بالکل غیر معتبر ہی کیوں نہ ہوں (ملاحظہ فرمائیے: سلطانِ ما محمد، مجموع

مقالاتِ سیرت، از مولانا عبدالماجد دریابادی، مقدمہ وترتیب نو ڈاکٹر تحسین فراقی، مطبوعہ دارالتذکیر لاہور: ص ۱۴۱ تا ۱۴۶)

۷۵۔ الغزالی، محمد، فقہ السیرۃ۔ تخریج العلامہ محمد ناصر الدین الالبانی۔ دارالشروق، ب ت: ص ۱۴

۷۶۔ مقدمۂ کتاب ''پیغمبرِ انسانیت۔ تالیف مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، طبع پنجم ۲۰۰۶ء: ص ۱۲

۷۷۔ کلماتِ بابرکات در ابتدا کتاب سیرۃ المصطفیٰ: ج ۱، بدون صفحہ نمبر

۷۸۔ ملاحظہ فرمایئے: مقدمہ سیرت النبی ﷺ: ص ۶۶ تا ۱۰۲

۷۹۔ السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ۔ مکتبۃ العلوم والحکم المدینۃ المنورۃ، الطبعۃ السادسۃ ۱۴۱۵: ج ۱، ص ۱۴۔

۸۰۔ صحیح السیرۃ النبویۃ۔ تقدیم الدکتور عمر سلیمان الاشقر۔ مراجعۃ الدکتور ہمام سعید۔ دارالنفائس الاردن، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۵ھ: ص ۱۲

۸۱۔ حیاۃ محمد۔ دارالمعارف مصر، الطبعۃ الرابعۃ عشر، ب ت: ص ۴۶

۸۲۔ حوالۂ بالا: ص ۸۰

۸۳۔ مقامِ صحابہ: ص ۲۸

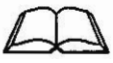

مطالعۂ سیرت کی عملی جہتیں

سید عزیز الرحمٰن

﴿۱﴾

Abstract

The Study of Seerah or the life of the holy Prophet Muhammad (Peace be upon him) has been the subject of interest for the Muslim scholars and the Orientalists of the past, present, and will remain in the future. All, have been studying and interpreting the Seerah of the holy Prophet Muhammad (peace be upon him) from spiritual, social, eoconomic and political perspectives. This academic endeavour is prevaling till this day, and will remain under focus till the Day of Judgement. This paper attempts to understand and anlayse different approaches or methodology undertaken by the Seerah writers, in the field of Seerah. Examples of these have been presented in this article.

اس سرائے فانی میں آنے والے ہر شخص کو کامیابی کی تلاش ہوتی ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ پھر کامیابی کے حصول کے لئے کامیاب شخصیات کی طرف نظر اٹھنا اور ایسے لوگوں کو تلاش کرنا بھی فطرت کا تقاضا ہے، جو اپنے اپنے مقام پر کامیاب قرار پائے۔ ہر دور میں انسان نے کامیابیوں کے سفر کے لئے کامیاب لوگوں کے حالات جاننے کی کوشش کی، اور ان کی خدمات اور سوانحی اشاروں کو توجہ سے پڑھا اور

ان سے اپنے لئے سبق حاصل کرنے کی سعی کی۔

اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ ہر دور کی اور ہر عہد کے انسان کی ضرورت ہے، ایسی ضرورت جس میں کسی کو کلام نہیں۔ کیوں کہ آپ ﷺ کے حالات اور سیرت کے اوراق خود اس بات کی گواہی ہیں کہ کام یاب سے کام یاب ترین شخص بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ نمائی کا محتاج ہے۔ سیرت کا ایک اور اہم ترین پہلو یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی رہ نمائی سے پوری طرح روشن ہے۔

سیرتِ طیبہ کو سمجھنے اور اس سے رہ نمائی حاصل کرنے کی ضرورت کو جاننے کے لئے قرآن حکیم کی اس آیت مقدس پر غور کرنا نہایت ضروری ہے، سورۂ احزاب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۱)

بلاشبہ تمہارے لئے رسول اللہ (صل اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں بہترین نمونہ عمل ہے۔

مسلمانوں کا فنِ سیرت سے اعتنا دیکھ کر خیال یہی ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے جہاں ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق اور محبت کا جذبہ کارفرما ہے، وہیں اسوۂ حسنہ اور آپ ﷺ کی ذاتی زندگی کے احوال و آثار سے واقفیت کا فطری داعیہ بھی اُس کا اہم سبب ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جب آپ کی ذات کو اسوۂ حسنہ قرار دیا تو اس کا واضح نتیجہ یہی ہے کہ ہمیں اپنے دینادی زندگی کو مرتب کرنے اور ہر میدان میں کام یابی کے لئے سیرت طیبہ ہی سے راہ نمائی حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے سوا ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔

فن سیرت کا آغاز درحقیقت بعثت نبوی کے روز اول سے ہی ہوگیا تھا، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وہ تاریخی جملہ فن سیرت کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے، جب وحی الٰہی کے آغاز پر جبرئیل امین سے ملاقات اور سورہ علق کی اولین پانچ آیات کی شکل میں قرآن کریم اور وحی الٰہی کے ابتدائی نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے ان حالات کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا تھا:

والله مايخزيك الله ابدا، انك لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف، وتعين على نوائب الحق (۲)

خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دے گا۔ آپ بلا شبہ صلہ رحمی کرتے ہیں، لاچاروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، کم زوروں کو کما کر دیتے ہیں، مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں

اور اہلِ حق کی اعانت کرتے ہیں۔

یہ جملے ادبی اعتبار سے بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ جن سیرت نگاروں نے ادبی پیرایۂ بیان اختیار کیا ان کی پیش رو بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ بے شمار جہتوں سے کیا جاسکتا ہے۔ خود آپ ﷺ کے بارے میں عہد سابق کی کتب مقدسہ میں بیان ہونے والی پیشن گوئیاں بھی ایک وسیع اور دل چسپ موضوع ہیں۔

ان پیشین گوئیوں میں انجیل کی ایک پیشین گوئی دل چسپ بھی ہے، اور معنی خیز بھی۔ یوحنا کا ایک مکاشفہ اس طرح بیان ہوا ہے

اور قوموں کو مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ (۳)

یہاں اس پیشین گوئی میں واضح طور پر منہ سے نکلنے والی تیز تلوار سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور گفت گو کی تاثیر ہے۔ اس کے علاوہ اس روایت کا اور کوئی مفہوم نہیں ہوسکتا۔ یہ پیشین گوئی دراصل سچائی کی طاقت کی طرف اشارہ ہے، یہ اس بدیہی اور واضح حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام فطری سچائی ہے، جسے اگر اس کی اصل شکل میں پیش کردیا جائے تو اس کی تاثیر کو مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ اپنا وجود خود منوائے گی اور سچ محض اپنی قوت سے ظاہر ہوتا چلا جائے گا۔

مطالعۂ سیرت کا اہم ترین اسلوب یہ ہے کہ ہم سیرتِ طیبہ کے ہر واقعے کو اس نیت سے پیش نظر رکھیں کہ اس سے ہمیں اپنی عملی زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی رہ نمائی اور ہدایت ضرور حاصل ہوگی۔ اسورۂ احزاب کی مذکورہ بالا آیت لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کا یہی مفہوم ہے۔

مطالعۂ سیرت کے اس انداز کو اپنانے کی کئی کوشش کی گئی ہیں۔ فقہ السیرہ کے زیرعنوان لکھی جانے والی عربی کتب سیرت بھی اس حوالے سے اچھا مطالعہ فراہم کرتی ہیں، مگر ان کا موضوعاتی دائرہ قدرے محدود ہے۔ حالیہ برسوں میں عربی میں بعض کتب ایسی شائع ہوئی ہیں، جن میں بیان سیرت کے ساتھ ساتھ واقعات سیرت سے حاصل ہونے والے اسباق و دروس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس نوعیت کی کاوشیں بعض سیرت نگاروں کے ہاں اردو میں بھی نظر آتی ہیں۔ جن کا تذکرہ و تجزیہ سردست مقصود نہیں۔ ہم نے اس اسلوب میں چند واقعات سیرت پیش کرنے کی ذیل میں سعی کی ہے۔ یہ واقعات ابتدا میں تو تاریخی ترتیب سے درج کئے گئے ہیں، بعد میں متفرق واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے اسباق و حکمتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ کوئی عالمانہ نہیں فقط طالب علمانہ کوشش ہے، جو نتائج راقم کے قلم نے اخذ کئے ممکن ہے وہ بعینہ درست نہ ہوں، پھر ان نتائج و اسباق کے ساتھ ساتھ مزید حکمتیں اور عبرتیں بھی اس میں یقیناً پوشیدہ ہوں گی، مگر یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سیرت طیبہ کو اس طرح بھی پڑھنا چاہئے، اور یہ کوشش ہونی چاہئے کہ ہم اس کے حرف حرف، اور سطر سطر سے اخذ فیض کریں اور مطالعۂ سیرت کے ذریعے حاصل ہونے والی روشنی سے اپنی حیات مستعار کو منور کریں، تاکہ حیات ابدی ظلمتوں سے محفوظ اور دائمی کامیابی سے سرفراز ہو سکے۔

ذیل میں واقعات سیرت اور ان میں موجود حکمتوں اور دروس وعبر پر قدرے اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے، سب جانتے ہیں کہ عربوں میں خانہ جنگیوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان لڑائیوں میں سے ایک لڑائی حرب فجار (گناہ کی لڑائی) کے نام سے مشہور ہے، کیوں کہ یہ لڑائی حرمت والے مہینوں میں قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان لڑی گئی۔ پہلے قبیلہ قیس والے قریش پر غالب آئے، پھر بعد میں قریش والے قبیلہ قیس پر غالب آئے۔ آخر صلح پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے بعض چچاؤں کے اصرار پر اس میں شریک ہوئے۔ مگر قتال نہیں فرمایا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال تھی۔ (۴)

۲۔ حرب فجار کے بعد لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح گزشتہ زمانے میں قتل و غارت گری سے بچنے کے لئے فضل بن فضالہ اور فضل بن وداعہ اور فضیل بن حارث نے حلف الفضول کے نام سے ایک معاہدہ مرتب کیا تھا، اسی طرح کا معاہدہ اب کیا جائے۔ ابتدا میں جن لوگوں کو اس معاہدے کا خیال آیا تھا ان کے ناموں میں لفظ فضل موجود تھا، چناں چہ اسی مناسبت سے اس کو حلف الفضول کا نام دیا گیا تھا۔

شوال میں حرب فجار کا سلسلہ ختم ہوا۔ ذیقعدہ میں حلف الفضول کے لئے بات چیت شروع ہوئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ سب سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب اس معاہدے اور حلف کے محرک ہوئے۔ بنو ہاشم اور بنی تیم عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے، جو نہایت مہمان نواز اور حضرت عائشہؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ اس وقت سب نے مظلوم کی حمایت واعانت کا عہد کیا کہ خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا، دیسی ہو یا پردیسی، حتی الامکان اس کی مدد واعانت سے دریغ نہ کریں گے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس معاہدے کے وقت میں بھی عبداللہ بن جدعان کے مکان

میں موجود تھا۔ اس معاہدے کے مقابلے میں اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو ہرگز پسند نہ کرتا اور اگر اب زمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدے کی طرف بلایا جاؤں تو اس کی شرکت کو قبول کرلوں گا۔ (۵)

ملاحظہ کیجئے کہ دو واقعے ہیں، دونوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ اور آپ کے خاندان والے شامل ہیں، ایک لڑائی کا موقع ہے، ایک صلح کا۔ ایک میں آپ ﷺ بے دلی سے شریک ہوتے ہیں، اور لڑائی سے اپنا دامن بچاتے ہیں، اور دوسرے واقعے میں صلح کے لئے دل وجان سے تیار ہو جاتے ہیں، اور یہ تک فرماتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں سرخ اونٹ تک پسند نہیں کروں گا، جو اس وقت کی سب سے قیمتی متاع تھے۔ اور یہ کہ آئندہ بھی اس نوعیت کی ہر دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا صلح کے لئے، مظلوموں کی مدد اور ان کی نصرت کے لئے ہم اسی جذبے سے کام کرتے ہیں؟ ہمیں لڑائی پسند ہے یا صلح؟ اس سے ہمیں خود علم ہوسکتا ہے کہ ہم اسوۂ حسنہ سے کس قدر قریب ہیں؟ یا اس حوالے سے ہم میں کس قدر کمی پائی جاتی ہے۔

۳۔ انسان آزاد تولد ہوا ہے۔ آزادی انسان کی فطرت ہے، انسان کو ہر ذلت، ہر نقصان، ہر تکلیف گوارا ہے، مگر اپنی آزادی پر سمجھوتا وہ کم ہی کرتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بہ قائم ہوش وحواس انسان نے اپنی آزادی پر غلامی کو ترجیح دی ہو۔ البتہ تاریخ انسانی میں صرف ایک واقعہ ایسا ملتا ہے، جب کسی نے غلامی کو آزادی پر فوقیت دی اور اپنی آزاد حیثیت کو کسی کی غلامی پر قربان کردیا۔ یہ سعادت در سعادت تھی، اور یہ سعادت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی۔ زید بن حارثہ مشہور عرب قبیلے بنو کلب سے تعلق رکھتے تھے، آٹھ سال کی عمر میں ننھیال جاتے ہوئے ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئے، انہوں نے حضرت زیدؓ کو عُکاظ کے بازار میں لاکر بیچ دیا۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حضرت حکیم بن حزامؓ نے انہیں خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کی نذر کردیا۔ حضرت خدیجہ سے شادی کے بعد زیدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ رہنے لگے۔

کچھ عرصے بعد ان کے والد اور چچا کو علم ہوا کہ زید فلاں جگہ ہیں، وہ آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آکر فدیہ دے کر انہیں آزاد کرنے کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کہ میں زید کو بلاتا ہوں، وہ اگر جانا چاہے تو بلا فدیہ میری طرف سے آزاد ہے، لیکن اگر وہ میرے ساتھ رہنے پر مُصر رہا تو میں اسے واپس نہیں کروں گا۔ وہ راضی ہوگئے، زید آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا تم انہیں پہچانتے ہو؟ بولے جی ہاں، یہ میرے والد اور چچا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں پوری آزادی ہے، اگر چاہو تو ان کے ساتھ جاسکتے ہو اور اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتے ہو۔ زید بے اختیار بول

اٹھے کہ میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس جانا نہیں چاہتا۔

ان کے والد اور چچا چلائے کہ کیا تم آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتے ہو؟ کیا اپنے باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتے ہو؟ زید نے جواب دیا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو باتیں دیکھی ہیں، ان کا مشاہدہ کر لینے کے بعد اب آپ پر میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ یہ سن کر وہ واپس لوٹ گئے۔

ادھر ذاتِ رسالت مآب علیہ الصلاۃ والتسلیم نے جب یہ منظر دیکھا تو انہیں اسی وقت آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر اعلان کر دیا کہ تم سب گواہ رہنا، آج سے میں نے زید کو بیٹا بنا لیا ہے، یہ میرا وارث ہوگا، اور میں اس کا۔ اس وقت تک میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ یہ واقعہ نبوت سے قبل کا ہے، بعثت کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اسلام لانے والے پہلے چار افراد میں شامل تھے۔ آپ ۸ھ میں غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔ (۲)

غلاموں سے آزادی اسی صورت میں مل سکتی ہے، جب انسانیت دامنِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہو جائے۔ جسم پر حکم چلایا جا سکتا ہے، ذہن پر حکم رانی کی جا سکتی ہے، مگر دلوں کو صرف اور صرف حسن اخلاق اور حسن کردار سے ہی مسخر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت زیدؓ نے حسن اخلاق کا ہی مشاہدہ کیا تھا، مگر وہ حسن اخلاق جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے، جہاں، قانون، ضابطے، روحانیت، آداب، اخلاق اور عبادات سب ایک ہی نظام کا حصہ تھے، جہاں ہر بات میں یک رنگی تھی، ان بلند اخلاق کے مقابل حضرت زیدؓ کی نگاہ کسی اور چیز پر کیسے جم سکتی تھی؟

۴۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۳۵ برس ہوئی تو قریش نے بیت اللہ کی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے قبل عمارت آتش زدگی اور سیلاب کے نتیجے میں بوسیدہ ہو چکی تھی، کچھ حصہ ڈھے بھی چکا تھا، اتفاق سے اسی دوران جدے کے ساحل پر ایک بحری جہاز ٹکرا کر ناکارہ ہو گیا۔ قریش نے اس کا سامان خرید لیا، پرانی عمارات گرا دی گئی، اور از سرِ نو تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ اس موقع پر یہ بھی طے کیا گیا کہ اس کارِ خیر میں ہر شخص اپنی صرف حلال کمائی سے شریک ہوگا۔ کعبۃ اللہ کی تعمیر کا کام مختلف قبائل میں تقسیم ہو گیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس تعمیری عمل کا حصہ رہے۔ دیواریں اٹھاتے، پتھر لاتے اور کام کرنے والوں کا ہاتھ بٹاتے رہے، جب حجر اسود کو نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو قبائل میں سخت اختلاف پیدا ہوا۔ ہر ایک اس شرف کا خواہاں تھا، اختلاف بڑھا تو لڑائی کا خدشہ پیدا ہوا، تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ عام رواج کے مطابق یہ لڑائی اگر ایک بار چھڑ جاتی تو برسوں بیت جاتے اور آگ ٹھنڈی نہ ہو پاتی۔ ایسے میں ابو امیہ بن مغیرہ جیسے معمر اور جہاں دیدہ سردار نے تجویز پیش کی کہ کل

جو سب سے پہلے کعبے میں داخل ہوا سے ثالث بنالیا جائے اور اس کے فیصلے پر سب سر تسلیم خم کردیں۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کرلیا۔

اب خدا کی قدرت دیکھئے، سب سے پہلے جو داخل ہوئے وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، آپ کو دیکھ کر سب بے اختیار بول اٹھے کہ آپ امین ہیں، آپ کے فیصلے پر ہم راضی ہیں۔ اب کس قدر عمدہ موقع تھا کہ آپ خود اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو نصب فرمادیتے۔ یا اپنے خاندان یا قبیلے کے حق میں فیصلہ فرمادیتے۔ مگر وہ ذات جو قرآن کی زبان میں پوری انسانیت کو یہ درس دینے آئی تھی:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۷)

تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل سے ہاتھ اٹھالو۔ ہر صورت میں انصاف سے کام لو کہ وہی خوف خدا کے حصول کا سب سے قریب ترین راستہ ہے۔

وہ یہ فیصلہ کیوں کر فرما سکتی تھی؟ آپ نے ایک چادر منگوائی اور اس پر حجر اسود کو رکھ کر تمام قبائل کے نمائندوں کو دعوت دی کہ اس کا ایک کونا پکڑ لیں، یوں حجر اسود کو اس کے مقام تنصیب تک لے جایا گیا، بیت اللہ کے قریب پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اسے نصب فرمادیا۔ (۸)

اس طرح تقریباً مقدر ہوجانے والی لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور جناب رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت سے قبل از نبوت بھی انسانیت کو ایک بڑے المیے سے بچالیا۔

اس واقعے میں کتنے ہی روشن نکات ہمیں دعوت عبرت دے رہے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ معاشرہ جاہلی معاشرہ کہلاتا ہے، یہ واقعہ نبوت سے قبل کا ہے، حلال اور حرام کے اسلامی ضابطے ابھی نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھی عرب سرداروں کو اللہ کے گھر کا پاس تھا، حرام وحلال کی فہم تھی اور اس بات پر یقین تھا کہ کم از کم اچھے کام میں برا پیسہ استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ ایک آج ہمارا مذہبی معاشرہ ہے، دین داروں کا رویہ ہے، بار بار کی تنبیہ کے باوجود حرام کھانے کے ایسے ایسے جواز ڈھونڈ لئے جاتے ہیں کہ انسان تھرا اٹھے اور خوف سے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرام وحلال کی تقسیم فطری ہے، انسان اس سے اصولی طور پر واقف ہوتا ہے، البتہ اس کی جزوی تفصیلات وتفریعات کے لئے احکامات نازل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، یا اس پیغام فطرت کو تازہ رکھنے اور دلوں میں زندہ کرنے کے لئے بار بار احکامات بھیج کر یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ قریش مکہ کو اس حقیقت کا علم تھا اور ہم فطرت سے دور ہونے کی وجہ اس بدیہی کھلی حقیقت سے دور ہوچکے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت عملی کا بہترین نمونہ پیش فرمایا اور انصاف کا بھرپور مظاہرہ کر کے پیغام دیا کہ انصاف اختیار کے بعد ہی ہوتا ہے، جب کہ ہمارے ہاں انصاف کی دہائی اس وقت تک ہوتی ہے، جب تک اختیار ہمیں نہیں ملتا، جب مل جائے تو انصاف کے تقاضے اور اس کے ترازو تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۴۰ سال کو پہنچی تو آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ پر پہلی وحی کا نزول ہوا۔ اس پہلی وحی کا اسلوب اور پیغام بھی نہایت بلیغ اور پر از مطالب ہے۔ ارشاد ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ O اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ O الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ O (۹)

پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھئے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ اس نے قلم کے ذریعے سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا ہی نہ تھا۔

دیکھئے کتنے بڑے بڑے نکات چند آیات میں سمو دیئے گئے ہیں۔ ہمارے مطلوب نظام تعلیم کا بنیادی خاکہ ان آیات میں پورے کا پورا موجود ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تعلیم سے پہلے اپنے خالق اور مالک کی معرفت اور اسے پہچاننا ضروری ہے، اپنے خالق کو پہچانے بغیر حاصل شدہ علم وفن معرفت کا ذریعہ نہیں بن سکتا، پھر علم کا آغاز رب کے نام یعنی اس کے اثبات سے ہوگا، اس کے انکار سے نہیں، چناں چہ اپنے پروردگار کا انکار کرنے والا علم، علم نہیں سراسر جہل ہے۔

پھر فرمایا کہ تعلیم انسان کو اپنے حقیقت سے بے پروا کرنے کا سبب بھی نہیں بننی چاہئے، تعلیم سے اس میں گھمنڈ، غرور اور کبر بھی پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ اسے ہر صورت میں اپنی حقیقت اپنے پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے ایک لوتھڑے سے، جمے ہوئے خون کے حصے سے پیدا کیا ہے، کسی بھی سبب سے اس کا اترانا اور اکڑنا لایعنی ہے۔ پھر یاد رکھو کہ تمہارا پروردگار جو تمہارا استاد اول بھی ہے، عزت اور بزرگی والا ہے۔ یہاں دونوں کے لئے پیغام ہے، استاد کے لئے بھی اور شاگرد کے لئے بھی، استاد کو تو یہ تلقین ہے کہ تمہیں اپنی بزرگی اور عزت کا پاس رکھنا ہے، کوئی ایسا عمل نہیں کرنا، جو تمہارے مقام کے منافی اور تکریم کے خلاف ہو اور طالب علم کو یہ تلقین ہے کہ استاد کسی صاحب فضل وتکریم کو بناؤ، تاکہ تم میں علم کا صحیح احساس پیدا ہو سکے۔

آگے ارشاد ہے کہ اللہ نے علم کو قلم کے ذریعے سکھایا۔ یہ قلم کے مقام کا بیان بھی ہے اور اس کی

اہمیت کی جانب اشارہ بھی ہے، اور قلم سے کام لے کر علم کو، اپنی معلومات کو قلم بند کرنے کی تلقین بھی ہے، تاکہ علم کا سفر آگے بڑھ سکے اور آئندہ آنے والے بھی اپنے پہلوں کے علم وفضل سے استفادہ کر سکیں، اور آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ سکھایا جو اس سے قبل انسان کے علم میں نہ تھا، یعنی استاد وہ ہے جو طالب علم کے علم میں نئی باتوں کا اضافہ کرے، تحصیل حاصل اس کا معمول نہیں ہونا چاہئے۔ لایعنی امور سے بچنا بھی استاد کی ذمے داری ہے، اور طالب علم کا فریضہ ہے کہ وہاں رجوع کرے جہاں سے وہ ان باتوں کو جان سکے جو اس سے قبل اس کے علم میں نہیں تھیں۔ یوں ہی کاروانِ علم آگے بڑھے گا اور مقصد نبوت کی تکمیل ہوگی۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ ان دونوں افراد یعنی ابوجہل بن ہشام یا عمر بن الخطاب میں سے جو زیادہ محبوب ہو اس کے ذریعے اسلام کو غلبہ عطا فرما۔ (یہ دونوں قریش میں بہت قوی، بہادر اور ذی حیثیت سمجھے جاتے تھے) طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات کی رات میں دعا کی کہ اے اللہ عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعے اسلام کو عزت بخش، پھر جمعے کے روز صبح کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور حلقہ اسلام میں شامل ہو گئے۔ (۱۰)

دیکھئے ایک جیسی صلاحیتوں والے دو اشخاص ہیں۔ دونوں اسلام کے کٹر دشمن، دونوں کے لئے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے ہیں، ایک کے حق میں دعا قبول ہوتی ہے اور وہ دامانِ نبوت سے وابستہ ہو کر عمر بن خطاب سے فاروق اعظم بن جاتے ہیں، اور تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روشن حروف کے ساتھ امر ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں نام دوسرے کا بھی محفوظ ہے، مگر اچھے الفاظ میں نہیں۔ یہ تبدیلی، یہ فرق صرف دامان نبوت کا صدقہ ہے، جس سے وابستگی ایک کو میسر آئی تو اس شخصیت کا کردار ہی تبدیل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ صلاحیت کی اہمیت اپنی جگہ، مگر اصل کام دامنِ رحمت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے، اس سے قبل کچھ بھی نہیں۔ اس لئے صلاحیت پر اترانے کا کسی کو حق حاصل نہیں، اصل چیز توفیقِ الٰہی ہے، جس کا سب کو ہمہ وقت طلب گار رہنا چاہئے۔

۷۔ ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے، اسلام لانا ایک بہت بڑی آزمائش بل کہ اپنی جانوں کو خطرات میں ڈال دینے کے مترادف تھا۔ مسلمان تھوڑے تھے، کم زور تھے، اس لئے مجبور تھے اور مکمل طور پر مشرکین مکہ کے رحم وکرم پر تھے۔ مشرکین کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے، اور مسلمانوں کے سامنے کوئی ایسی صورت نہ تھی جیسے اختیار کر کے وہ ان مشکلات سے چھٹکارا پا سکتے۔ ایسے میں ناامیدی کے جذبات اگر سر اٹھاتے تو

قطعاً غیر متوقع نہ تھا، لیکن صحابہ کرام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے، اس لئے ان کے پایۂ ثبات کو استقلال حاصل رہا۔ البتہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہوں نے اس خواہش کا ضرور کیا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعا فرمائیں، چناں چہ ایک موقع پر حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے جو ان چند صحابہ میں شامل تھے، جن پر ظلم وتشدد اپنی بدترین حدوں سے بھی گزر چکا تھا، آپ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ:

الا تستنصر لنا؟ الا تدعوا الله لنا ؟

آپ ہمارے لئے مدد کیوں طلب نہیں کرتے؟ ہمارے لئے اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا:

كان الرجل فيمن قبلكم يحفرله فى الارض فيجعل فيه فيجاء بالمنشارِ فيوضع على رأسه فيشق باثنين وما يصده ذلك عن دينه ويمشط بامشاط الحديد مادون لحمه من عظم او عصب وما يصده ذلك عن دينه والله ليتمن هذا الامر حتى يسير الراكب من صنعاء الى حضر موت لايخاف الا الله او الذئب على غنمه و لكنكم تستعجلون (۱۱)

ایمان لانے کے جرم میں گذشتہ امتوں کے افراد کے لیے گڑھا کھودا جاتا تھا، اور انہیں اس میں ڈال دیا جاتا تھا، پھر آروں کو سر پر رکھ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے۔ لیکن یہ سزا بھی انہیں ان کے دین سے نہیں روک سکتی تھی، اسی طرح لوہے کے کنگھے ان کے گوشت میں گھسا کر ان کی ہڈیوں اور پٹھوں پر پھیرے جاتے تھے، اور یہ سزا بھی انہیں اُن کے دین سے نہیں روک سکتی تھی۔ خدا کی قسم اسلام کا معاملہ اپنے کمال کو ضرور پہنچے گا، اور پھر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ ایک سوار مقام صنعا (یمن) سے حضر موت تک سفر کرے گا، مگر اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا، یا صرف بھیڑیوں کا خوف ہوگا کہ کہیں وہ اس کی بکریوں کو نہ کھا جائیں، لیکن تم لوگ عجلت سے کام لیتے ہو۔

سختیاں تو ہر اچھے کام کے راستے میں آتی ہیں، مگر راہ حق میں سختیوں کو بنیاد بنا کر سہولتوں کی تلاش کرنا یا فطری رفتار کو نہ سمجھتے ہوئے نتائج میں جلدی کرنا کسی صورت میں مفید نہیں ہوسکتا۔

۸۔ جب قریش کو ہر طرح سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی جھنجھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی تو انہوں

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کو اس قدر ڈرایا کہ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نرمی کا مشورہ دینے لگے، اس پر آپ ﷺ نے وہ جملہ ارشاد فرمایا جو عزم و استقلال کی معراج کے حصول کے بغیر نہیں کہا جا سکتا، آپ ﷺ نے فرمایا:

یا عم، واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی، والقمر فی یساری علی ان اترك هذا الامر، حتی یظهره الله، او اهلك فیه، ما ترکته (۱۲)

اے چچا! اگر قریش میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں، تاکہ میں اپنی دعوت کا یہ عمل ترک کر دوں، تب بھی میں حق کے اعلان سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا دین سب پر غالب آ جائے یا میں اس راستے میں کام آ جاؤں۔

ہر بڑے مقام میں عزم و استقلال کی اہمیت مسلم ہے، حالات کے جبر سے گھبرا کر راستہ تبدیل کر لینا، با موقف میں کم زوری دکھا دینا مومن کا شیوہ نہیں ہے، یہی اس واقعے کا سبق ہے۔

۹۔ کچھ عرصے کی دعوت کے بعد چند مزید اہم اور ذی حیثیت حضرات بھی مسلمان ہو گئے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ ان میں نمایاں ترین ہیں۔ ان کے ایمان لانے سے اسلام کو جو تقویت پہنچی اس سے قریش کو بہت تشویش لاحق ہوئی۔ قریش کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے اپنے ایک معزز سردار ابوالولید عتبہ بن ربیعہ کو جو شعر گوئی، کہانت اور سحر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفت گو کرنے کے لئے تیار کیا۔ ایک روز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد الحرام میں تنہا بیٹھے تھے اور قریش دار الندوہ میں جمع تھے۔ عتبہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی شرافت نسبی اور مرتبہ میں کسی کو کلام نہیں لیکن آپ نے ایک امر عظیم پیش کیا ہے جس سے قوم میں تفریق پیدا ہو گئی ہے۔ آپ ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں، ہمارے آباو اجداد کو احمق اور نادان بتاتے ہیں، آپ نے ہمیں عرب میں رسوا کر دیا ہے، اب وہ کہتے ہیں کہ قریش میں بھی ساحر و کاھن موجود ہیں، میں اس بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، آپ میری بات توجہ سے سنیں۔ جو امور میں آپ کے سامنے رکھوں گا اگر ان میں سے کوئی بات آپ نے قبول کر لی تو فساد رک جائے گا''۔

آپ نے فرمایا: اے ابوالولید کہو میں سنتا ہوں۔ عتبہ نے کہا:

اے میرے بھتیجے، نبوت کے دعوے سے اگر آپ کا منشا مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم سب مل کر آپ کے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی آپ کی برابری نہیں کر سکے گا، اگر آپ شرف و سرداری چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کر لیں گے، کوئی

شخص آپ کی مرضی کے خلاف کام نہیں کرے گا، اگر آپ کی غرض بادشاہ بننا ہے تو ہم آپ کو بادشاہ مقرر کرلیں گے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر آپ شادی کرنا چاہتے ہیں تو جس عورت سے یا جتنی عورتوں سے آپ چاہیں گے ہم شادی کردیں گے۔ اگر آپ کو ان میں سے کسی چیز کی خواہش نہ ہو بل کہ یہ باتیں جنون کی وجہ سے ہوں تو ہم سب مل کر کسی کامل طبیب کو بلا کر آپ کا علاج کرائیں گے، تاکہ آپ کو صحت ہو جائے، بعض اوقات بیماریاں سمجھ میں نہیں آتیں مگر کسی کامل طبیب سے علاج کرانے پر صحت ہو جاتی ہے۔

عتبہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ ''اے ابو الولید کیا تم کہہ چکے جو کہنا چاہتے تھے''۔ ابوالولید نے کہا کہ ہاں میں کہہ چکا۔ پھر آپ نے سورۂ حم سجدہ کی ۳۸ آیتیں، آیت ۱ تا ۳۸ تلاوت فرمائیں، جن کا ترجمہ یہ ہے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ یہ (کتاب) بڑے مہربان نہایت رحم والے کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں عربی زبان میں علم والوں کے لئے مفصل بیان کی گئی ہیں۔ (یہ کتاب) خوش خبری سنانے والی اور ڈرانے والی ہے۔ پھر ان میں سے بہت سے لوگوں نے تو منہ موڑ لیا، پس وہ سنتے ہی نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل تو اس بات سے جس کی طرف تو ہم کو بلاتا ہے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور تیرے درمیان میں پردہ پڑا ہوا ہے۔ پس تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ میں بھی تم جیسا ایک آدمی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، پس تم اسی کی طرف سیدھے چلے جاؤ اور اسی سے معافی مانگو اور مشرکوں پر افسوس ہے، جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے بے انتہا اجر ہے، اور آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اُس کا انکار کرتے ہو جس نے دو روز میں زمین بنائی۔ اور تم اس کے ساتھ اوروں کو شریک کرتے ہو۔ وہ تو تمام جہان کا رب ہے۔ اور اس نے زمین میں اوپر سے پہاڑ پیدا کر دیئے اور اس میں برکت رکھی اور اس میں ٹھہرا دیں اس کے رہنے والوں کی خوراکیں (یہ سب کچھ) چار دن میں (کیا، جواب پورا ہوا) سوال کرنے والوں کے لئے۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھوئیں۔ (جیسا) ہو رہا

تھا۔ پھر اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے انہوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ پھر دو روز میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان کی طرف اس کا حکم بھیجا اور نیچے کے آسمان کو ہم نے ستاروں سے سجایا اور حفاظت کے لئے بھی (یہ ستارے بنائے)۔ یہ تدبیر ہے زبردست دانا کی۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو عاد اور ثمود کی کڑک جیسی کڑک سے خبردار کرتا ہوں، جب ان کے آگے اور پیچھے سے ان کے پاس پیغمبر آئے کہ اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو۔ انہوں نے کہا اگر ہمارے رب کو منظور ہوتا تو فرشتے بھیج دیتا۔ پس جو کچھ تم لے کر آئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے۔ پس وہ جو عاد کے لوگ تھے انہوں نے ملک میں ناحق تکبر کیا اور کہا ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ وہ اللہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوت والا ہے۔ اور وہ تو ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ پھر ہم نے ان پر منحوس دنوں میں آندھی بھیجی، تاکہ ہم ان کو رسوائی کے عذاب کا مزہ دنیاوی زندگی میں چکھادیں۔ اور آخرت کا عذاب تو اور بھی رسوائی کا ہے اور ان کو کہیں مدد نہ ملے گی۔ اور وہ جو ثمود کے لوگ تھے پس ہم نے ان کو راستہ دکھایا تھا۔ پھر ان کو ہدایت کے مقابلے میں گم راہی ہی اچھی معلوم ہوئی۔ پس ان کے اعمال کے سبب سے ان کو ذلت کے عذاب کی کڑک نے آ لیا اور جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہتے تھے ہم نے ان کو بچالیا۔ اور جس روز اللہ کے دشمنوں کو جہنم کی طرف گھیر کر لایا جائے گا پھر وہ قسم قسم جدا کئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس لائے جائیں گے تو ان پر ان کے کان اور آنکھیں اور جلدیں گواہی دیں گے اس کام کی جو وہ کرتے تھے۔ اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہم پر کس لئے گواہی دی؟ وہ کہیں گے ہم کو اس اللہ نے گویا کر دیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا اور اسی نے تم کو اوّل بار پیدا کیا اور تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے اور تم (اپنی بداعمالیاں) اس (خوف) سے نہیں چھپاتے تھے کہ تم پر تمہارے کان، اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی دیں گی بل کہ تمہارا تو یہ خیال تھا کہ اللہ جانتا ہی نہیں اور تمہاری اسی بدگمانی نے تمہیں برباد کیا جو تم نے اپنے رب کے حق میں کی تھی، پس تم خسارے میں پڑ گئے۔ پس اگر یہ لوگ صبر کریں تو بھی آگ ان کا ٹھکانا ہے اور اگر معافی چاہیں گے تو ان کو معافی نہیں دی جائے گی۔ اور ہم نے کفار کے لئے (برے) رفیق مقرر کر دیئے کہ انہوں نے

ان کی اگلی اور پچھلی باتوں کو ان کی نظر میں بھلا کر دکھایا۔ اور من جملہ ان جنوں اور انسانوں کے گروہوں کے کہ جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں ان پر بھی اللہ کا کلام پورا ہوا۔ بیشک وہ خسارے میں پڑے ہوئے تھے۔ اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو سنو بھی نہیں اور اس میں غل مچاؤ، شاید تم غالب آؤ۔ پھر ہم کافروں کو ضرور سخت عذاب چکھا دیں گے اور ان کو ان برے کاموں کا ضرور بدلہ دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ یہ آگ یعنی دوزخ اللہ کے دشمنوں کی سزا ہے۔ ان کا اس میں ہمیشہ رہنے کا گھر ہے یہ اس کے بدلے میں ہے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ اور کافر کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم کو وہ جن اور وہ آدمی تو دکھا دے جنہوں نے ہم کو گم راہ کیا تھا کہ ہم ان کو اپنے پاؤں تلے کچل ڈالیں تا کہ وہ بہت ہی ذلیل ہوں، بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) تم نہ ڈرو اور نہ رنج کرو اور اس بہشت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے دنیا میں بھی دوست تھے اور آخرت میں بھی اور بہشت میں تمہارے لئے ہر چیز موجود ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور تم جو مانگو گے وہاں ملے گی۔ یہ مہمانی ہے غفور الرحیم کی طرف سے۔ اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور خود بھی اچھے کام کئے اور کہا کہ میں بھی فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی اور برائی کو نیکی سے دفع کرو۔ پھر ناگاہ وہ شخص کہ اس میں اور تجھ میں عداوت تھی گویا وہ دوست حمایتی ہے اور یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے اور اگر کبھی شیطانی وسوسہ تجھے باز رکھے تو اللہ سے پناہ مانگ، کیوں کہ وہ بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے اور اس کی نشانیوں میں رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں۔ تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بل کہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو بنایا ہے اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تکبر کریں تو جو فرشتے آپ کے رب کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پشت کی جانب زمین پر ٹیک کر سننے میں محو تھا۔ آپ نے سجدہ کی آیت تک تلاوت کر کے سجدہ کیا۔ پھر عتبہ سے فرمایا کہ اے عتبہ تم نے سن لیا اب غور کرو کہ ہمیں اور تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ عتبہ اسی کیفیت میں وہاں سے اٹھ کر قریش کے

سرداروں کے پاس آیا۔ عتبہ کو دیکھ کر ابوجہل نے کہا کہ عتبہ وہ عتبہ نظر نہیں آتا۔ عتبہ تو صابی (بے دین) ہوگیا۔ عتبہ نے کہا کہ میں نے ان کا کلام سنا ہے خدا کی قسم میں نے ایسا کلام اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ واللہ نہ وہ شعر ہے اور نہ سحر ہے اور نہ کہانت۔ پس خدا کی قسم یہ کلام اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عنقریب اس کی ایک شان ہوگی۔ اے قریش کے لوگو! تم میرا کہا مانو۔ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے نہ پڑو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ شخص غالب آ گیا تو اس کا غلبہ تمہارا غلبہ ہے اور اس کی عزت تمہاری عزت ہے اور اس کی حکومت تمہاری حکومت ہے، اس لئے کہ وہ تمہاری ہی قوم میں سے ہے اور اگر وہ مغلوب ہوا تو تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا، تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ قریش نے کہا اے ابوالولید عتبہ اس شخص نے تمہیں اپنے کلام سے مسحور کر دیا۔ عتبہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی اب تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ (۱۳)

۱۰۔ اس کے بعد پھر کسی موقع پر تمام بڑے سرداران قریش بیت اللہ میں جمع ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں مشورہ کیا، طے یہ ہوا کہ ایک نمائندہ وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جائے، جو اس موضوع پر آپ سے بات کرے، چناں چہ وفد آیا اور اس وفد نے وہی باتیں دہرائیں جو اس سے قبل عتبہ کہہ چکا تھا، اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی پیش کش کی جو اس سے قبل عتبہ آپ کو کر چکا تھا، اس پر آپ نے فرمایا:

> اب میں جو کہتا ہوں وہ سنو! مجھے نہ تمہارے مال و دولت کی ضرورت ہے اور نہ تمہاری بادشاہت و سرداری کی اور نہ میرے دماغ میں خلل ہے۔ مجھے اللہ نے تمہاری طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے، مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں برائی سے ڈراؤں اور بھلائی کی نصیحت کروں۔ میرا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ اگر تم اس کو قبول کرو گے تو یہ تمہارے لئے دنیا و آخرت کی سعادت و فلاح کا ذریعہ ہے اور اگر انکار کرو گے تو میں صبر کروں گا اور اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا۔ (۱۳/ الف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سن کر سرداران قریش بولے کہ اے محمد! اگر ہمارے پیش کردہ کوئی بات بھی قابل قبول نہیں ہے تو آپ جانتے ہیں کہ شہری وسائل کے لحاظ سے نہ تو کوئی ہم سے زیادہ تنگ ہے، نہ پانی کے معاملے میں کوئی اور ہم سے کم ہے، نہ زندگی کے وسائل کے حوالے سے ہم سے زیادہ سخت زندگی گزارنے پر مجبور ہے، سو آپ اپنے اس رب سے جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ ان پہاڑوں کو یہاں سے منتقل کر دے، جن کی وجہ سے ہماری زندگی تنگ ہو چکی ہے، تاکہ ہمارا

شہر کشادہ ہو جائے اور شام وعراق کی طرح کوئی نہر ہمارے لئے جاری کردے، اور دنیا سے گزر جانے والے ہمارے اجداد میں سے کسی کو واپس لوٹا دے، خصوصاً قصی بن کلاب کو، اس لئے کہ وہ سچا سردار تھا ،تاکہ ہم اس سے آپ کی باتوں کے بارے میں پوچھ سکیں کہ کیا یہ سب کچھ حق ہے یا باطل ہے۔ اگر وہ آپ کی تصدیق کردے اور ہمارے مطالبات پورے ہو جائیں تو ہم بھی آپ کی تصدیق کردیں گے اور آپ کے اللہ کے ہاں مقام ومرتبے اور آپ کے رسالت کو جان لیں گے۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپنی وہی بات دہرائی کہ مجھے اللہ نے تمہاری طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے، مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں برائی سے ڈراؤں اور بھلائی کی نصیحت کروں۔ میرا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ اگر تم اس کو قبول کرو گے تو یہ تمہارے لئے دنیا وآخرت کی سعادت وفلاح کا ذریعہ ہے اور اگر انکار کرو گے تو میں صبر کروں گا اور اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا۔ (۱۳/ب)

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی ہر دولت پیش کی جارہی تھی، تب وہ کون سا داعیہ تھا، جو آپ کو ابتلا، پریشانی اور مصائب کے اس گرداب کو جھیل لینے مگر اپنے موقف سے پیچھے نا ہٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اگر اس نکتے پر غور کرلیا جائے تو مقام نبوت اور اس کی ذمے داریوں کا کسی قدر اندازا کیا جاسکتا ہے۔

۱۱۔ مکہ مکرمہ میں دعوت اسلام میں مشکلات بڑھتی دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال ۱۰ نبوی میں طائف کا رخ کیا، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں لوگوں سے ملاقات کی اور اسلام کا پیغام پہنچایا، مگر کسی نے توجہ نہ کی، بل کہ بعض لوگوں نے تو اپنے اوباش نوجوانوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا۔ انہوں نے پتھر برسائے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا سر پھٹ گیا۔ ظلم کی حد یہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف کی شدت سے بیٹھ جاتے تو وہ بدبخت اٹھا کر کھڑا کردیتے، آپ چلنے لگتے تو پھر سنگ باری شروع کردیتے، فقرے کستے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار عتبہ بن ربیعہ نامی ایک رئیس کے باغ میں پناہ لی۔ اس طرح ان اوباشوں سے آپ کی جان چھوٹی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا یہ سخت ترین دن تھا، رب کائنات کا جلال اس صورت میں آیا کہ جبریل امین ملک الجبال (یعنی پہاڑوں پر مامور فرشتے) کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں پہنچے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کہ اگر آپ حکم دیں تو ان دونوں پہاڑوں کو ملا کر اس بستی کو نابود کردوں، جن کے درمیان طائف اور مکہ موجود ہیں۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بستی ہلاکتوں اور سزاؤں کے لئے

نہیں، معافی اور درگزر کا اسوۂ حسنہ لے کر آئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، بل کہ مجھے امید ہے کہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو اللہ کی عبادت کریں گے، اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ (۱۴)

یہ مرحلہ افسوس، رنج، غم، جذبات کی شدت، انتقام، مایوسی اور بے دلی کا تھا، مگر قیادتوں کو رہ نمائی فراہم کرنے اور راہ نماؤں کو تلقین ہدایت کرنے والے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے تلقین یہ فرمائی کہ مایوس تو ایک ناامید انسان ہوتا ہے، اور ناامید شخص کے سامنے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ مومن کی زندگی تو امید کی فصل کاشت کرنے کے لئے عطا ہوئی ہے، اس کی امید جس ذات سے وابستہ ہے وہ حی اور قیوم ہے، مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے۔ جب ایک زندگی بخش ذات سے تعلق استوار ہو گیا تو اب مایوسی کا کیا مطلب؟ مزا تو اسی میں ہے کہ سخت ترین حالات میں بھی اسی سے تعلق استوار رکھا جائے اور مایوسی کی فضاؤں سے بھی امید کشید کی جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس عمل میں ایک بہت اہم پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ انسان بسا اوقات کسی خاص علاقے میں کام کرنا چاہتا ہے، مگر اسے وہاں ماحول سازگار نہیں ملتا، ایسے میں ماحول کی شکایت کرنے کی بہ جائے ہمیں اپنا میدان کار تبدیل کر لینا چاہئے، اس عمل میں کسی خاص خطے یا علاقے سے ہماری انسیت رکاوٹ نہیں بننی چاہئے۔ کسی بھی علاقے سے انسان کا تعلق فطری ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کی سنت یہ ہے کہ اولیت پیغام اور اس کے ابلاغ کو حاصل ہے، اگر یہ کام ہو رہا ہے تو زمین اور سرزمین سے محبت کے فطری تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنے میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اگر اصل مقصد متاثر ہو رہا ہے تو پھر ترجیح پیغام کو ہوگی اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ایسے مقام کی جانب ہجرت کی جائے گی، جہاں کام کرنے کی راہیں روشن محسوس ہوں گی، خواہ تجربے سے یہ بات غلط ہی ثابت ہو۔

۱۲۔ دعوت اسلام کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ مختلف مواقع پر ایام حج اور میلوں میں باہر سے آنے والے قبائل کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ یہ دعوت بہت واضح اور نہایت سادہ الفاظ پر مشتمل تھی۔ آپ فرماتے:

> **یا ایھا الناس ان اللہ عز وجل یامرکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیئا (۱۵)**
> اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک مت کرو۔

قریش اس دعوت کی مخالفت کرتے، مگر کلمہ حق آہستہ آہستہ مکے سے آگے بڑھ کر اطراف کے قبائل تک پہنچتا رہا، فوری طور پر زیادہ حمایت حاصل نہ ہوئی، مگر اکا دکا لوگ مسلمان ہوتے اور کاروان اسلام میں شامل ہوتے رہے۔ اہل مدینہ مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ سب سے پہلے قبیلہ خزرج کے حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے پھر نبوت کے گیارہویں سال اسی قبیلے کے چھ افراد نے اسلام قبول کیا۔ آئندہ سال ان چھ میں سے پانچ افراد کے ساتھ سات نئے افراد حاضر ہوئے، یوں یہ وفد بارہ افراد پر مشتمل تھا، انہوں نے چند نکات پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ یہ پہلی بیعت عقبہ کہلاتی ہے۔ عقبہ گھاٹی کو کہتے ہیں، یہ بیعت ایک گھاٹی میں ہوئی تھی۔ اس بیعت کے بنیادی نکات یہ تھے:

۱۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور صرف اسی کی عبادت کریں گے۔

۲۔ چوری اور زنا نہیں کریں گے۔

۳۔ اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔

۴۔ کسی پر تہمت نہیں لگائیں گے۔

۵۔ ہر اچھی بات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں گے۔

اگر یہ شرائط پوری کریں گے تو ان کے لئے جنت ہوگی، ورنہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا، چاہے تو عذاب دے اور اگر چاہے تو بخش دے۔ (۱۶)

مستشرقین کی جانب سے یہ بات بہت زور شور سے کہی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ آنے کے بعد حکمران بن گئے تھے، تاریخی اعتبار سے یہ بات درست ہونے کے باوجود اس کا مفہوم ان کے ہاں منفی ہوتا ہے، یہاں دیکھئے کہ ہجرت مدینہ کی بنیاد ڈالی جارہی ہے، انصارِ مدینہ کے اولین جانثار آپ کے دستِ مبارک پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرائط پر بیعت کررہے ہیں، آپ جو چاہیں منوا سکتے ہیں، مگر شرائط میں کیا باتیں طے ہوتی ہیں؟ کیا ان میں سے کسی ایک بات کا بھی تعلق اختیار، اقتدار، قوت یا ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے؟ آپ نے ان شرائط میں اپنے لئے یا اپنے اہل خانہ کے لئے ایک نکتہ تک نہیں رکھا، یہ تک نہیں پوچھا کہ میں اگر آیا تو میری کفالت اور رہنے سہنے کا کیا ہوگا؟ وہی باتیں ان سے منوائیں جو خود ان کے فائدے کی تھیں، اور جن کی ادائیگی میں کوتاہی تھی، یہی نبوت کا مقصد تھا، یہی رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تھا، اور یہی منہج دعوت ہے کہ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھوٹ کر دعوت اسلام پھیلانا اور اپنے معاملات کے لئے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ کرنا۔

۱۳۔ آئندہ برس نبوت کے تیرہویں سال موسم حج میں دوسرا بڑا وفد حاضر خدمت ہوا اور آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ۷۵ افراد نے جن میں ۲ خواتین بھی شامل تھیں بیعت کی۔ یہ دوسری بیعت عقبہ کہلاتی ہے۔(۱۷) اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار مدینہ نے مدینہ منورہ آنے کی دعوت دی۔ یوں ہجرت مدینہ کا باقاعدہ اہتمام ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات سے خطاب کر کے اس وقت ایک نہایت پر اثر وعظ فرمایا۔ جس میں آپ نے اپنی اطاعت کی تلقین کی۔ یہ سن کر ان حضرات نے پوچھا کہ اگر ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا صلہ ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت، یعنی آخرت کی وہ نعمتیں جو کبھی ختم نہ ہوں گی۔ پھر ایک شریک نے سوال کیا کہ ہمارے بعض یہود سے تعلقات ہیں، جو آپ سے تعلقات کے بعد ختم ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی نصیب فرمائے تو آپ ہمیں چھوڑ کر مکے واپس چلے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر مسکرائے اور یہ اعلان فرمادیا:

> ہرگز نہیں، اب میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہے، تم میرے ہو، میں تمہارا ہوں، جس سے تمہاری جنگ ہے، اس سے میری جنگ ہے، اور جس سے تمہاری صلح ہے، اس سے میری صلح ہے۔(۱۸)

مکہ مکرمہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق فطری تھا، پھر بیت اللہ کی موجودگی نے اسے مزید محترم بنادیا تھا، وہاں سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت وقتی مصلحتوں کے تحت تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے ۵۳ سالہ تعلق کو انصارِ مدینہ کے ساتھ تعلق پر قربان کر دیا، اور جو کہا وہ سچا کر دیکھایا، فتح مکہ کے بعد بھی آپ مدینہ منورہ میں ہی رہے اور آج بھی آپ وہیں پر آسودۂ خواب ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۴۔ سال ۱۳ نبوی کا ذکر ہے، مدینہ سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ایک گروہ کو اپنے ہم راہ لے کر حج کی ادائیگی کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مسلمانوں کے اس گروہ کی تعداد ۷۵ بیان کی جاتی ہے۔ ان مسلمانوں نے ایام تشریق میں آں حضرت ﷺ کے دست مبارک پر شہر سے باہر ایک گھاٹی میں بیعت کی۔ اس سے قبل ایک سال پہلے اسی گھاٹی میں انصار مدینہ کے کوئی بارہ افراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر چکے تھے، اس بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور دوسری بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ نومسلم تھے، مگر ایمان کے اس قدر پختہ اور عملی طور پر اس قدر متحرک اور دینی جذبات سے آراستہ کہ انہوں نے فوراً نبی اکرم ﷺ کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت دے دی۔ یہ دعوت کوئی رسمی دعوت نہ تھی،

اس کے خطرناک مضمرات اور دوررس نتائج مرتب ہو سکتے تھے، ان خطرات سے یقیناً یہ مسلمانان مدینہ بھی واقف تھے، مگر ان کے ایمان کا اعجاز ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا، کوئی تردد انہیں پیش نہیں آیا، وہ کسی قسم کے تذبذب کا شکار نہیں ہوئے اور ہر طرح کے خطرات مول لینے کے لئے وہ فوراً تیار ہو گئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت تک اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور اسلام کے لئے خیر خواہی کے جذبات رکھتے تھے، وہ اس ملاقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے، انہوں نے ان خطرات کو محسوس کیا اور انصار مدینہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اے لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ محمد (ﷺ) ہمارے ہاں محفوظ ہیں، اور ہم ان کی حفاظت کے ذمے دار ہیں، جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، محمد (ﷺ) اپنی قوم میں احترام اور عزت کے مقام کے حامل ہیں اور ہم ان کے حامی و مددگار ہیں، تم ان سے کوئی عہد یا اقرار لینے سے پہلے سوچ لینا (کہ یہ نازک اور مشکل کام ہے) جو قدم بھی اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ اگر تم اپنا وعدہ پورا کر سکو تو بہتر ہے، ورنہ بہتر ہے کہ خاموش ہو جاؤ، اور ابھی کہہ دو، تاکہ تمہیں بعد میں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور دشمنوں کی عداوت کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب جس کے الفاظ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں اور جن الفاظ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، کہنے کو تو مختصر الفاظ ہیں، مگر ان کی تہہ میں جو تنبیہات چھپی ہوئی ہیں، جن خطرات سے وہ آگاہ کر رہے ہیں وہ معمولی حیثیت نہیں رکھتے، وہ اتنے سرسری نوعیت کے نہیں جنہیں نظر انداز کیا جا سکے، مگر تاریخ ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس قدر سخت تنبیہ، اس قدر واضح موقف کے باوجود اس وقت موجود انصار سے ایک نے بھی اپنے وعدے، اپنے اقدام اور اپنے ارادے پر کسی طرح سے پشیمانی کا اظہار نہیں کیا، اپنی رائے تبدیل نہیں کی، حتیٰ کہ اپنے موقف پر دوبارہ غور و فکر کرنے کے لئے چند لمحوں کی مہلت بھی نہیں طلب کی، بل کہ کہا تو صرف اس قدر کہ

اے عباس (رضی اللہ عنہ) آپ نے جو کچھ کہا وہ ہم نے سن لیا اور سمجھ لیا۔

گویا کہ موقف میں کسی تبدیلی، رائے میں کسی ترمیم اور ارادے میں کسی طرح کی نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اور پھر انہوں نے رسول خدا ﷺ سے عرض کیا:

قد سمعنا ما قلت، فتكلم يا رسول الله، فخذ لنفسك و لربك ما احببت (۱۹)

ہم نے سن لیا جو کچھ آپ نے کہا، یا رسول اللہ آپ اپنے لئے اور اللہ کے لئے ہم سے جو چاہیں عہد

لے لیں، ہم حاضر ہیں۔

کلمۂ طیبہ اگر دل سے پڑھا جائے تو ایمان کی یہی کیفیت ہوتی ہے، اور اگر صرف زبان سے اقرار کیا جائے اور اس کے اثرات دل میں محسوس نہ ہوں تو ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہمارے ایمان میں کیا کمی ہے؟ انصار مدینہ نے محض کلمۂ توحید ادا کیا تھا، اس کے علاوہ کوئی ریاضت، کوئی عبادت ابھی تک نہیں کی تھی، مگر ان کا ایمان کسی قدر مکمل تھا، اس واقعے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۵۔ مکہ مکرمہ میں مشرکین کے مظالم کے بعد ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہوا، ہجرت حبشہ کے بعد ہجرت مدینہ کی اجازت ملی تو صحابۂ کرام نے مدینے کا رخ کیا، ان صحابۂ کرام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہجرت سب سے نمایاں ہے، سب نے چھپ کر ہجرت کی، سوائے عمر بن خطاب کے، انہوں نے علانیہ ہجرت کی، تلوار لٹکائی، کمان کاندھے پر ڈالی، تیر ہاتھ میں لیا، نیزہ کمر سے باندھا، حرم میں آئے، بیت اللہ کا طواف کیا، دو رکعت ادا کیں، پھر قریش کے ہر حلقے میں گئے اور اپنی ہجرت کا اعلان کیا، انہیں چیلنج کیا، مگر حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ کسی نے ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔ اس سارے عمل کا فائدہ ان مظلوم و بے کس مسلمانوں کو ہوا، جو تنہا ہجرت کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے، ایسے کوئی ۲۰ صحابہ کا قافلہ حضرت عمرؓ کے ساتھ شریک ہجرت ہوگیا۔ (۲۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور اس کی قبولیت کا ایک مظہر یہ واقعہ بھی ہے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شان اس واقعے سے پوری طرح ہویدا ہے۔ شجاعت عمر کا اس سے بڑھ کر اور کیا اظہار ہوسکتا ہے؟

۱۶۔ قریش مکہ کو ہجرت مدینہ اور اس کے نتیجے میں مدینہ منورہ میں اسلام کی اشاعت پر سخت تشویش تھی، جب صورت حال ان کے خیال میں حد سے آگے بڑھ گئی تو انہوں نے آخری انتہائی قدم اٹھایا، دارالندوہ میں مشورے کے لئے سرداران قریش جمع ہوئے اور طے پایا کہ نعوذ باللہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو آج رات قتل کردیا جائے، اور اس عمل میں ہر قبیلہ یوں شریک ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لئے کسی ایک سے بدلہ لینا ممکن ہی نہ رہے۔ (۲۱)

ادھر یہ مشورہ طے پا رہا تھا، ادھر اللہ تعالیٰ آپ کو ہجرت کی اجازت عطا فرما رہا تھا، ساتھ ہی یہ تلقین بھی تھی کہ آج رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر نہ گزاریں، اس موقع ہر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا آپ کے ہم راہ ہجرت کرنے کا فیصلہ بھی ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی سے امانتیں حضرت علیؓ کو سونپ کر ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچ گئے، رات کو وہیں سے غار ثور کو روانگی ہوئی، یوں آپ ﷺ کے سفر

ہجرت کا آغاز ہوگیا۔(۲۲)

دیکھئے دشمن تلوار سونتے سر پر کھڑا ہے، وہ یہ طے کر چکا ہے کہ آج آپ ﷺ کو نہیں چھوڑنا، مگر ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ایسے دشمن کی بھی تمام امانتوں کی ادائیگی کا اہتمام فرماتے ہیں، اگرچہ اس مقصد کے لئے حضرت علیؓ کو بھی خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، مگر دشمن کی رقم سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ دشمن تو دشمن بھائی کی امانت کو بھی ہتھیانے میں ذرا عار و شرم محسوس نہیں کرتے۔ نیز دیکھئے کہ دشمن جان لینے کا خواہش مند ہے، مگر امانتیں رکھنے کے لئے اس کے سامنے کوئی دوسرا امین و سچا انسان آپ ﷺ کے سوا موجود نہیں ہے۔ ہر مومن سے یہی کردار مطلوب ہے، جب دشمن بھی اعتراف پر مجبور ہو جائے۔

۱۷۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ بعض مستشرقین یہ کہتے ہیں کہ مدینے میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم راں بن گئے تھے، ملاحظہ کیجئے کہ مدینے آکر آپ کو رہائش کی ضرورت محسوس ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے لئے حجرے تعمیر کرائے۔ ابتدا میں صرف حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ کے لئے حجرے تعمیر کروائے، کہ اس وقت تک یہی دو آپ کے نکاح میں تھیں، بعد میں مزید ضرورتوں کے تحت دیگر حجرے بھی تعمیر ہوتے رہے۔ مگر ملاحظہ کیجئے کہ دو جہاں کے سردار اور نبوت و رسالت کے آخری تاج دار صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ حجرے کس طرح کے تھے؟ روایات سیرت میں ان حجروں کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یہ حجرے کھجور کی شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائے گئے تھے، ان حجروں کی لمبائی دس ہاتھ چوڑائی چھ ہاتھ اور اونچائی صرف اسی قدر تھی کہ آدمی کھڑے ہو کر چھت کو چھو لے، دروازوں پر صرف ٹاٹ پڑے رہتے اور راتوں کو ان حجروں میں چراغ تک نہیں جلتے تھے۔(۲۳)

بلا سبب عناد سے بھرے دلوں اور بغض آشنا قلموں کا حال تو چھوڑیئے دیکھئے کہ خود ہمارے لئے بھی اس حقیقت میں کس قدر اسباق موجود ہیں:

الف: اس قدر جاں نثار صحابۂ کرام کی موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی آسائش سے رہ سکتے تھے، مگر آپ نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

ب: فتوحات کے بعد بھی آپ ﷺ کا طرزِ حیات یہی رہا، حال آں کہ ہمارے ہاں معمولی سے معمولی شخص کا طرز بھی ذرا سا فراخی کے بعد یک سر تبدیل ہو جاتا ہے۔

ج: ہم سب اپنے اپنے مقام پر دیکھ سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں ہمارا رویہ سیرت طیبہ سے کس قدر مناسبت رکھتا ہے؟

۱۸۔ مدینہ طیبہ میں آمد کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار ومہاجرین کے مابین مواخات کروائی۔ (۲۴) یہ عجیب قسم کا رشتہ تھا، نہ قوم کا تعلق نہ قبیلے کا، نہ رشتہ نہ ناتا، نہ علاقہ ایک نہ شہر، صرف ایک ہے تو کلمہ ایک ہے، وہ نبی ایک ہے جس کے نام پر دیوانے کھنچے چلے آتے ہیں، وہ کتاب ایک ہے، جو درسِ ہدایت ہے، درس اخوت ومساوات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا بھائی قرار دیا تو یہ رشتہ خون کے رشتوں سے بڑھ گیا۔ یوں بھی ہوا کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں، اس نے اپنے بھائی کو پیش کش کردی کہ جو تمہیں پسند ہو اسے طلاق دے دیتا ہوں، تم اس سے شادی کرلو، مگر اس کا مہاجر بھائی شکریے کے ساتھ یہ پیش کش لوٹا کر فقط یہ کہتا ہے کہ مجھے بازار کا رستہ بتادو، میں خود برگزر بسر کی سبیل پیدا کرلوں گا۔ (۲۵)

ایسا ایثار تاریخ نے دیکھ نہ سنا، نہ اس سے قبل ایسا نظارہ دیکھنے کو ملا نہ اس کے بعد۔ یہ نبوت کی برکت تھی اور صحابہ کی بے نفسی، جس نے ان کی آن میں ایسا انقلاب برپا کردیا کہ اب اس کی مثال ہی دی جاسکتی ہے، اسے دہرایا نہیں جاسکتا۔

ایک تو وہ دور تھا، اور ایک آج کا دور ہے، جب سگے بھائیوں کے مابین بھی خلیج پاٹنے کے لئے ثالثی کی ضرورت پیش آتی ہے، اور پھر بھی نفرتوں کا دریا چڑھتا ہوا ہی دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی افرادی قوت بہت کم تھی اور مسلمانوں کو کمک کی بہت ضرورت تھی مگر میدان جہاد میں بھی دشمن کے مقابلے میں اور دشمن بھی وہ جو آپ کو نیست ونابود کرنے پر تلا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلند ترین اخلاقی معیار کو پورے اعزاز کے ساتھ برقرار رکھا، اس موقع پر دو اصحاب رسول حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوحسیل رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)، ہم مکے سے آرہے ہیں راستے میں مشرکین نے ہمیں گرفتار کرلیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، مگر یہ مجبوری کا عہد تھا، ہم کافروں کے خلاف ضرور لڑیں گے، لیکن نبی رحمت ہادی اعظم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا:

انصرفا، نفي لهم بعهدهم، ونستعين الله عليهم (۲۶)

تم میدان جنگ سے واپس چلے جاؤ، ہم ہر حال میں ان سے اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے اور ہمیں صرف خدا کی حمایت ومدد درکار ہے۔

عین میدان جنگ میں رسول خدا کی ہم رکابی اور دشمنان دین سے لڑنے کی خواہش رکھنے والے

فرزندان توحید کو اپنے دشمن سے بہ امر مجبوری کئے گئے وعدے کی پاس داری کی تلقین، جب کہ عددی طور پر دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہونے کے سبب اس وقت ایک ایک فرد کی اہمیت تھی، یہی مزاج نبوت ہے، یہی اسلام کی تعلیم ہے، اور اسلام کا انسانِ مطلوب ان صفات کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔ اور اس کا خلاصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری جملہ ہے کہ ہم دشمن پر اللہ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں، اگر انسان کی نظر اس قدر بلند ہو جائے تو دھوکہ دہی فریب، اور بدعہدی کی جڑ ہی کٹ کر رہ جائے۔

۲۰۔ ابن اسحاق عروہ بن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنگِ بدر میں شکست کی خبر کے بعد ایک روز عمیر بن وہب الجمحی اور صفوان بن اُمیہ حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عمیر بن وہب قریش کے سرکش اور شریر لوگوں میں سے تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مقیم تھے اس وقت یہ آپ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کو تکلیف دیا کرتا تھا، بدر کے قیدیوں میں اس کا بیٹا وہب بن عمیر بھی تھا۔ صفوان نے بدر کے مقتولین کا تذکرہ کر کے کہا خدا کی قسم ان کے بعد اب جینے کا مزہ نہیں رہا۔ عمیر نے جواب دیا خدا کی قسم تو سچ کہتا ہے۔ اگر میرے ذمے وہ قرض نہ ہوتا جس کو میں ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں اور اپنے بعد مجھے اپنے بچوں کے تلف ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور سوار ہو کر جاتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیتا، کیوں کہ میرا بیٹا بھی وہاں ان کے پاس قید ہے۔ صفوان نے کہا تو قرض اور بچوں کی فکر نہ کر۔ تیرا قرض میں ادا کروں گا اور تیرے اہل وعیال کی خبر گیری بھی میں اپنے اہل وعیال کی طرح کروں گا۔

پھر عمیر نے اپنی تلوار تیز کروائی اور اس کو زہر میں بجھایا اور وہاں سے روانہ ہو کر مدینے پہنچ گیا۔ اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے جنگ بدر کے بارے میں گفت گو کر رہے تھے اور اللہ کے انعام واکرام کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اچانک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر عمیر بن وہب پر پڑی جو اس وقت اپنے اونٹ کو مسجد نبوی کے دروازے پر بٹھا رہا تھا، اور تلوار اس کی گردن میں حمائل تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ اللہ کا دشمن عمیر بن وہب ہے، خدا کی قسم یہ کسی ناپاک ارادے سے آیا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے نبی یہ اللہ کا دشمن عمیر بن وہب ہے۔ جو تلوار حمائل کر کے آیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو میرے پاس لاؤ۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس کی تلوار کے دستے کو پکڑ لیا اور اس کو کھینچتے ہوئے لے چلے اور انصار کے جو لوگ ان (حضرت عمرؓ) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ان سے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بیٹھو اور اس خبیث آدمی سے آپ کی حفاظت کرو۔ پھر حضرت عمرؓ اس کو آپ کی خدمت میں لے گئے۔

جب آپ نے عمیر کو دیکھا تو حضرت عمرؓ اس کی تلوار کے دستے کو پکڑے ہوئے تھے، جو اس کی

گردن میں پڑا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا اے عمرؓ اس کو چھوڑ دو۔ اور پھر فرمایا اے عمیر قریب آ جاؤ، پھر وہ قریب ہو گیا اور زمانۂ جاہلیت کے طریقے سے سلام کیا۔ آپ نے فرمایا اے عمیر اللہ تعالیٰ نے ہمیں تم سے بہتر طریقے کے ساتھ نوازا ہے، جو سلام ہے اور جنت کے لوگوں کا طریقہ ہے۔ پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کس لئے آئے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس قیدی کے لئے آیا ہوں جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ اس بارے میں احسان فرمایئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تلوار کیوں حمائل ہے۔ اس نے کہا آخر ہماری تلواریں بدر میں کس کام آئیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے سچ بتاؤ تم یہ تلوار کیوں لے کر آئے ہو، کیا تم اور صفوان بن امیہ دونوں حطیم میں بیٹھ کر ان سرداروں کا تذکرہ نہیں کر رہے تھے جو بدر میں مارے گئے۔ پھر تم نے کہا کہ میرے ذمے قرض نہ ہوتا اور مجھے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیتا۔ پھر صفوان نے تمہارے قرض اور اہل وعیال کا ذمہ لے لیا کہ تم اس کے لئے مجھے قتل کرو گے۔ اور اس معاملے کے درمیان اللہ حائل ہے۔ (۲۷)

عمیر نے آپ کی گفت گو سن کر کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اے اللہ کے رسول ہم آپ کی اور جو کچھ آپ ہمارے پاس آسمانی پیغام لائے اس کی تکذیب کرتے رہے اور یہ ایسا معاملہ ہے کہ اس وقت میرے اور صفوان کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ پس خدا کی قسم مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ نے ہی آپ کو اس کی اطلاع دی۔ پس حمد وشکر ہے اس خدا کا جس نے اسلام کی طرف رہ نمائی فرمائی اور مجھے یہاں کھینچ لایا۔ پھر اس نے کلمۂ شہادت پڑھا۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا اپنے بھائی کو دین سکھاؤ اور قرآن پڑھاؤ اور اس کے قیدی کو چھوڑ دو۔ اسی وقت وہب بن عمیر اس کے حوالے کر دیا گیا۔

پھر عمیر نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ کے نور کو بجھانے کی بہت کوشش کرتا رہا اور جن لوگوں نے اللہ عزوجل کے دین کو اختیار کیا میں ان کو سخت تکلیفیں دیتا رہا اور اب میں چاہتا ہوں کہ مجھے مکے جانے کی اجازت دیں، تاکہ میں لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلاؤں اور ان کو اسلام کی دعوت دوں، شاید اللہ ان کو ہدایت نصیب فرمائے اور اگر یہ نہ ہوا تو میں اللہ کے دشمنوں کو ان کے کفر کی وجہ سے اسی طرح ستاؤں جس طرح میں اس سے پہلے آپ کے صحابہ کرامؓ کو ان کے دین کی وجہ سے ستایا کرتا تھا۔ آپ نے عمیر کو اجازت دے دی اور وہ مکے چلا گیا۔

ادھر عمیر کے مدینے جانے کے بعد صفوان بن امیہ لوگوں سے کہتا تھا کہ میں تمہیں آئندہ چند دنوں میں ایسی خوش خبری سناؤں گا کہ تم بدر کا واقعہ بھول جاؤ گے۔ صفوان ان دنوں ہر سوار سے عمیر کے بارے میں پوچھتا تھا، یہاں تک کہ ایک سوار نے آ کر اس کے اسلام کے بارے میں اطلاع دی۔ یہ سن کر صفوان

نے قسم کھائی کہ وہ عمیر سے کبھی بات نہیں کرے گا۔

حضرت عمیر کے پہنچ کر دعوتِ اسلام میں مشغول ہو گئے۔ ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ (۲۸)

دیکھئے ایمان کی قوت، کہ لمحۂ واحد میں برسوں کی فکر بدل کر انسان کا پورا نظام عمل تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے، اس واقعے میں ایمان کی جس قوت کا اظہار ہوا ہے، دراصل ہر مومن سے یہی قوت مطلوب ہے۔

۲۱۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ کعب بن اشرف کے قتل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ اس قسم کے یہودیوں کو جن کی شرارتیں اور سازشیں حد سے تجاوز کر چکی تھیں، جہاں کہیں پاؤ قتل کر ڈالو۔ چناں چہ حویصہ بن مسعود کے چھوٹے بھائی محیصہ بن مسعود نے جو مسلمان ہو چکے تھے ابن سینہ یہودی کو قتل کر ڈالا۔ ابن سینہ یہودی تجارت کرتا تھا۔

حویصہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور عمر میں محیصہ سے بڑے تھے۔ جب محیصہ نے ابن سینہ کو قتل کر دیا تو حویصہ نے محیصہ کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا اور کہا اے اللہ کے دشمن تو نے اس کو قتل کر ڈالا۔ خدا کی قسم اس کے مال میں سے کتنی ہی چربی تیرے پیٹ میں ہے۔ محیصہ نے کہا خدا کی قسم اس کو قتل کرنے کا حکم مجھے ایک ایسی ذات نے دیا ہے کہ اگر وہ تیرے قتل کا حکم دیتی تو میں ضرور تیری گردن بھی مار دیتا۔

حویصہ نے حیرت سے پوچھا کہ خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھے میرے قتل کا حکم دیں تو کیا واقعی تو مجھے قتل کر دے گا۔ محیصہ نے جواب دیا کہ ہاں خدا کی قسم اگر وہ مجھے تیری گردن مارنے کا حکم دیتے تو میں ضرور تیری گردن مار دیتا۔ حویصہ یہ سن کر حیران رہ گیا اور محیصہ سے کہا خدا کی قسم تیرا یہ دین بہت انوکھا ہے اور یہی دین حق ہے۔ پھر حویصہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ (۲۹)

دیکھئے صرف ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی گہرا تعلق اور شیفتگی ہی تھی، جس نے محیصہ کی کایا پلٹ دی۔ اس قبائلی ماحول میں اس نوعیت کی محبت کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا، اور یہ ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ تھا، جو صحابۂ کرام کو حاصل تھا۔

۲۲۔ صلح حدیبیہ کا منظر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ہم راہ عمرے کی غرض سے مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں، قریش مکہ اندر داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کرتے ہیں۔ بات چیت شروع

ہوتی ہے، قریش بات چیت کے لئے افراد منتخب کرتے ہیں، ایسے میں کنانہ کے ایک آدمی نے جس کا نام حلیس تھا اٹھ کر کہا مجھے ان کے پاس جانے کی اجازت دو، لوگوں نے کہا اچھا جاؤ۔ جب وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے پاس آ رہا تھا تو آپ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا یہ فلاں شخص ہے، اور یہ ایسے لوگوں میں سے ہے جو قربانی کے جانوروں کی تعظیم کرتے ہیں، اس لئے تم قربانی کے جانور لے کر اس کے سامنے سے گزرو۔ چناں چہ لوگوں نے قربانی کے جانور اس کے سامنے سے گزارے اور تلبیہ کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ جب اس نے قربانی کے جانوروں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل گئے اور کہنے لگا۔ سبحان اللہ ایسے لوگوں کو کعبہ سے روکنا مناسب نہیں۔ پھر وہ لوٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ میں قربانی کے جانور دیکھ کر آیا ہوں، ان کی گردنوں میں قلادے پڑے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے، اس لئے میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکا جائے۔ (۳۰)

دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے کہ قریش نے اس کی گفت گو سن کر اس سے کہا کہ بیٹھ جا، تو جنگلی ہے، تجھے کچھ پتہ نہیں۔ حلیس کو اس پر بہت غصہ آیا اور کہنے لگا ہمارا تمہارا معاہدہ نہیں ہے اور نہ ہم آپس میں اس بات پر حلیف ہوئے کہ خدا کے گھر سے اس شخص کو روکا جائے گا جو اس کی تعظیم کے لئے آئے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں حلیس کی جان ہے تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو موقع دو کہ وہ جو کرنا چاہتے ہیں کریں، ورنہ میں تمام حبشیوں کو لے کر تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ قریش نے کہا اچھا خفا نہ ہو ہم ذرا غور کر لیں۔ (۳۱)

یہ مرحلہ اشتعال کا تھا، عمرے کی ادائیگی کے لئے احرام باندھ کر اور قربانی کے جانور ساتھ لے کر مکہ مکرمہ آنے والے افراد کو یوں روک لینا ویسے بھی عرب روایات کے خلاف تھا، ایسے مرحلے پر حکمت کا دامن تھامے رکھنا آزمائش کی بات تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے محض اپنی حکمت عملی سے ایک بڑے سردار کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ یہ خاموش حکمت عملی ہی آج ہماری دعوت اور پیغام خداوندی کے ابلاغ کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اگر اس میں ہم غور کر سکیں۔

۲۳۔ اسی اثنا میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا۔ یہ سن کر آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میں ان سے بدلہ نہیں لے لوں گا یہاں سے حرکت نہیں کروں گا۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو بیعت کے لئے طلب فرمایا۔ (۳۲)

دیکھئے جب تک عمرے کا عزم تھا مکمل امن پسندی کے ساتھ، صلح جوئی کے جذبے سے مفاہمت کی

کوشش کی جارہی تھی، مگر جب بے گناہ انسان کی ناحق جان لینے کا مرحلہ سامنے آیا تو آپ ﷺ نے فوراً مقابلے کی تیاری شروع کردی۔ صلح کا مفہوم یہی ہے، یہ نہیں کہ حق و باطل کی تفریق کے بغیر دشمن کے مقابلے سر تسلیم خم ہوتا چلا جائے۔ کوشش یہی ہونی چاہئے کہ بلاوجہ انسانی جانوں کی حرمت متاثر نہ ہو لیکن شجاعت کے موقع پر مردانگی کا مظاہرہ بھی ایمان کا ناگزیر پرحصہ ہے۔

۲۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سن کر صحابۂ کرامؓ سے ایک درخت کے نیچے جس کے سایہ میں آپ بیٹھے ہوئے تھے، جہاد کے لئے بیعت لی۔ یہ کوئی معمولی بیعت نہ تھی، کیوں کہ مسلمانوں کی تعداد صرف ۱۴سو، ۱۵سو یا ۱۶سو (باختلاف روایت) تھی اور ان کے پاس کسی قسم کا سامان جنگ بھی نہ تھا، اور اپنے گھر بار سے تقریباً تین سو میل دور تھے، کسی قسم کی امداد اور سامانِ جنگ کا حصول تقریباً ناممکن تھا۔ دوسری طرف مشرکین مکہ اپنے مرکزی شہر میں تھے، اپنی پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرسکتے تھے، اور آس پاس کے اپنے حامی قبائل کو بھی اپنی مدد کے لئے بلاسکتے تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا پورا قافلہ جان کی بازی لگانے کے لئے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے فوراً تیار ہوگیا۔ اخلاص، ایمان اور اللہ کے راستہ میں جان کی بازی لگادینے کی یہ اعلیٰ ترین مثال ہے۔ (۳۳)

دیکھئے آغاز سفر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبر، تحمل، ضبط اور صلح کا مظاہرہ فرمارہے ہیں، مگر جب علم ہوتا ہے کہ آپ کے ایک جان نثار حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا ہے تو پھر کسی ادنیٰ تامل کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ مکہ سے صف آرا ہونے کا فیصلہ فرمالیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب مرحلہ ہے۔ اسی سے دنیا کو علم ہوا کہ اس سے قبل صلح کی باتیں، اس کا تصور، صبر و تحمل کا رویہ اور نرمی و تلطف کا مظاہرہ کسی کم زوری کی بنا پر نہیں تھا، یہ تو اسلام کا مزاج اور نبوت کا اختصاص ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت حکمت عملی کی تبدیلی حکمت کا تقاضا اور منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ ایسے میں جرأت کی ضرورت ہو تو بھی مومن کے قدم آگے ہی کی جانب بڑھتے ہیں۔ چناں چہ دیکھئے کہ ادھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان بیعت فرمایا اور ادھر صحابۂ کرام دیوانہ وار اسی سعادت میں سبقت کے لئے سرگرم ہوگئے۔ کوئی تو سبب ہے کہ قرآن کریم میں اس قدر زور بیان کے ساتھ یہ واقعہ ذکر کیا گیا۔ چناں چہ فرمایا گیا:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ اِذْيُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِي قُلُوبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيباً O وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَاْ خُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًاO (۳۴)

البتہ اللہ ایمان والوں سے راضی ہوگیا، جب کہ وہ اس درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، پھر اس نے معلوم کرلیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا پھر ان پر سکینت اتاری اور ان کو نزدیک آنے والی فتح دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی دے گا جن کو وہ لیں گے، اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔

۲۵۔ بیعت مکمل ہونے کے بعد حضرت عثمانؓ بھی صحیح وسالم واپس پہنچ گئے۔ صحابہؓ نے کہا اے ابو عبداللہ تم نے تو بیت اللہ کا طواف کرلیا۔ حضرت عثمانؓ نے جواباً کہا کہ تم نے میرے ساتھ سخت بدگمانی کی ہے، خدا کی قسم اگر مجھے ایک سال تک موقع ملتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں رکے رہتے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر طواف نہ کرتا۔ قریش نے تو مجھے طواف کرنے کے لئے کہا مگر میں نے انکار کردیا۔ (۳۵)

یہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی وابستگی ملاحظہ کیجئے۔ کعبۃ اللہ کے طواف جیسی سعادت بھی حاصل نہیں کی، صرف اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سعادت کے حصول سے روکا جارہا تھا، اور آپ کے بغیر وہ یہ سعادت نہیں چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نوعیت کی انتہائی گہری وابستگی کی حقیقت جب تک اقوامِ عالم کو سمجھ میں نہیں آئے گی، اس وقت تک وہ مقامِ نبوت سے آشنا نہیں ہوسکتے۔

۲۶۔ قریش کو جب اس بیعت کا علم ہوا تو وہ مرعوب اور خوف زدہ ہوگئے۔ اور صلح پر آمادہ ہوگئے۔ چناں چہ قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا جو نہایت فصیح وبلیغ مقرر تھا۔ لوگ اس کو خطیب قریش کہتے تھے، قریش نے ان سے کہہ دیا تھا کہ صلح صرف اسی شرط پر ہوسکتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سال واپس چلے جائیں۔ (۳۶)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن عمرو کو آتے دیکھ کر صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ اب تمہارا کام کچھ آسان ہوگیا۔ سہیل نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ ہمارے اور اپنے درمیان صلح نامہ لکھ دیں۔ پھر دیر تک صلح کی شرائط پر گفت گو ہوتی رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق رائے ہوگیا، اور آپ نے کاتب کو معاہدہ قلم بند کرنے کا حکم دیا اور فرمایا بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھو۔ سہیل نے کہا خدا کی قسم میں رحمان کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ بل کہ آپ یہ لکھوائیں باسمك اللهم جیسے آپ پہلے لکھوایا کرتے تھے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے کہا خدا کی قسم ہم تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سوا کچھ نہیں لکھیں گے۔ آپ نے فرمایا باسمك اللهم ہی لکھ دو۔ پھر آپ نے فرمایا (لکھو کہ) یہ وہ (معاہدہ) ہے جس پر

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فیصلہ کیا ہے۔ اس پر سہیل نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو ہم نہ تو آپ کو کعبے سے روکتے اور نہ آپ سے قتال کرتے۔ لہٰذا آپ محمد بن عبداللہ لکھوائیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں، اگرچہ تم نے میری تکذیب کی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا (اچھا) محمد بن عبداللہ ہی لکھ دو۔ اس شرط پر کہ تم ہمارے اور کعبے کے درمیان راستہ خالی کردو، تاکہ ہم کعبے کا طواف کرلیں۔ سہیل نے کہا خدا کی قسم اس سال نہیں (اس سال آپ طواف نہیں کرسکتے) کیوں کہ عرب کہیں گے کہ ہم مجبور ہوگئے، بل کہ آئندہ سال (آپ طواف کریں) پھر آپ نے یہی بات لکھوادی۔ (کہ اس سال نہیں بل کہ آئندہ سال طواف کریں گے) پھر سہیل نے کہا کہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہمارا جو آدمی آپ کے پاس جائے گا اس کو واپس کرنا ہوگا خواہ وہ آپ کے دین پر ہو۔ (۳۷)

دیکھئے آغاز ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کو دیکھ کر کسی منفی بات سے آغاز کرنے کی بہ جائے سہولت کا شگون لیا۔ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ برا شگون کوئی چیز نہیں ہے، البتہ نیک شگون لیا جاسکتا ہے، تاکہ انسان کا حوصلہ بلند ہو۔ ہمارا رویہ اس کے برعکس ہے۔ ہم آغاز ہی اس سوچ سے کرتے ہیں کہ پتہ نہیں ہم کام یاب ہوں گے؟ پتہ نہیں فریق ثانی کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ تذبذب ہمارے حوصلوں کو توڑ دینا ہے۔

اس واقعے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بڑے مقصد کے لئے، جس کے ثمرات آگے چل کر کھل کر سامنے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول اللہ کا لفظ تک ہٹا دینے پر آمادگی ظاہر فرمادی۔ اس عمل کے ذریعے پیغام یہ دینا مقصود تھا کہ مقاصد بلند ہوں تو یہ باتیں راستے کی رکاوٹوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اور وہ مقصد تھا مسلمانوں کو خطرات سے محفوظ کرکے دعوت اسلام کو زیادہ بڑے پیمانے پر عام کرنا۔ اسی صلح کے اثرات فتح خیبر کی شکل میں جب سامنے آئے تو قرآن کریم کے الفاظ فتح مبین کی حقیقت دنیا پر واضح ہوئی، اور حکمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتیں نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آئیں۔

۲۷۔ اسی اثنا میں ابوجندل بن سہیل بن عمرو بیڑیاں پہنے ہوئے قیدیوں کی چال چلتے ہوئے مکہ کے نشیب سے نکل کر آ گئے اور آتے ہی مسلمانوں کے سامنے گر پڑے۔ یہ ایک صحابی تھے اور محض کلمۂ توحید پڑھنے کے جرم میں اہلِ مکہ کی جانب سے قید اور پابند سلاسل تھے۔

سہیل نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پہلی بات ہے۔ جس پر میں نے آپ سے صلح کی ہے کہ آپ اس کو (ابوجندل) مجھے واپس کردیں۔ آپ نے فرمایا: بے شک ہم نے ابھی معاہدہ مکمل نہیں کیا

ہے۔ سہیل نے کہا خدا کی قسم پھر ہم کبھی بھی آپ سے کسی بات پر مصالحت نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا تم اس کو میری ضمانت میں دے دو، اس نے کہا میں اس کو آپ کی ضمانت میں نہیں دے سکتا۔ آپ نے پھر فرمایا ہاں تم اس کو میری ضمانت میں دے دو۔ سہیل نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا۔ ابو جندل نے کہا اے مسلمانو! کیا مجھے مشرکوں کی طرف لوٹا دیا جائے گا، جب کہ میں مسلمان ہو کر آیا ہوں کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ حقیقت میں ان کو اللہ کی راہ میں سخت تکلیفیں دی گئی تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو جندل صبر کرو اللہ تعالیٰ جلد تم لوگوں کے لئے سامان پیدا کرے گا۔ (۳۸)

یوں صلح کے راستے میں آنے والی ناجائز شرائط بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیں، مگر اپنے رویے سے بات چیت ختم یا معطل کرنے کا تاثر پیدا نہیں ہونے دیا۔

۲۸۔ صلح حدیبیہ کی شرائط طے ہوئیں، مگر یہ بہ ظاہر سب مسلمانوں کے خلاف تھیں، مثلاً یہ کہ اہل مکہ میں سے کوئی مسلمان ہو کر مدینے چلا جائے گا تو مسلمان اسے واپس لوٹانے کے پابند ہوں گے، مگر کوئی مسلمان واپس مکے آ گیا تو اسے لوٹایا نہیں جائے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام شرائط قبول کر لیں، اس کی سب سے اہم شق یہ تھی کہ آئندہ دس برس تک مسلمان اور قریش آپس میں جنگ نہیں کریں گے، ادھر اللہ تعالیٰ نے انا فتحنا لك فتحا مبينا فرما کر اسے فتح سے تعبیر فرمایا، درحقیقت نتائج کے اعتبار سے یہ ایک کھلی فتح تھی۔ (۳۹)

اس صلح کے چند نتائج ملاحظہ کیجئے:

الف: مسلمانوں کو باقاعدہ سیاسی قوت تسلیم کر کے دوسرے عرب قبائل کو اختیار دے دیا کہ وہ دونوں سیاسی طاقتوں (قریش اور مسلمانوں میں سے) جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدہ کر لیں۔

ب: دس سال تک جنگ نہ کرنے کے معاہدے نے مسلمانوں کو امن وسکون فراہم کیا اور عرب قبائل میں تیزی سے اسلام کی اشاعت کا موقع دیا، جس سے صرف دو سال کے مختصر عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد دوگنی سے بھی بڑھ گئی اور جب صلح کے صرف دو سال بعد قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ فتح کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو آپ کے ہم راہ دس ہزار سے زیادہ کا لشکر تھا۔ جب کہ صلح حدیبیہ کے وقت آپ کے ساتھ صرف ۱۴ سو صحابہؓ کی جماعت تھی۔

ج: جنگ نہ کرنے کے معاہدے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ نے اسلامی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیا اور اسلامی قوانین جاری کر کے مسلم معاشرے کو مکمل تہذیب وتمدن کی شکل دے دی۔

د: مسلمانوں کو عمرے کی اجازت دے کر قریش نے یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے بل

کہ اس کے پیرو بھی عربوں کی طرح حج وعمرے کے مناسک ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس سے اسلام کے خلاف عرب قبائل میں پائی جانے والی نفرت میں بھی کمی ہوئی۔

ھ: اس صلح کے نتیجے میں مسلمانوں نے شمالی اور وسطی عرب کی مخالف قوتوں کو آسانی سے زیر کرلیا، جس میں یہود کے سب سے بڑے گڑھ خیبر کا فتح ہونا اور تبوک کی یہودی بستیوں کا زیر نگیں آنا بھی شامل ہے۔ ان فتوحات کے نتیجے میں عرب میں طاقت کا توازن بدل گیا مشرکین کم زور ہوگئے اور اسلام روز بہ روز قوت حاصل کرتا چلا گیا۔

۲۹۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لے آئے تو ابوبصیر عتبہ بن اسد ثقفی جو قریش کا آدمی تھا وہ مسلمان ہوکر (مکہ سے بھاگ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگیا، قریش نے اس کو پکڑنے کے لئے دو آدمی بھیجے اور (ان کے ذریعہ یہ کہلوایا کہ آپ نے ہم سے جو وعدہ کیا ہے اس کا خیال کریں۔ لہٰذا آپ نے ابوبصیر کو ان دونوں آدمیوں کے حوالے کردیا اور وہ دونوں اس کو لے کر ذوالحلیفہ پہنچے، یہاں اتر کر وہ کھجوریں کھانے لگے۔ ابوبصیر نے ان دونوں آدمیوں میں سے ایک سے کہا خدا کی قسم مجھے تیری تلوار بہت عمدہ لگتی ہے۔ یہ سن کر اس شخص نے اپنی تلوار میان سے نکال لی اور کہا خدا کی قسم یہ بہت عمدہ ہے میں نے اس کو بار بار آزمایا ہے۔ ابوبصیر نے کہا کہ مجھے دو میں بھی تو دیکھوں کہ یہ کیسی ہے۔ اس آدمی نے تلوار ابوبصیر کو دے دی، ابوبصیر نے اسی تلوار سے اس شخص کو قتل کردیا اور دوسرا شخص بھاگ کر مدینے آ گیا اور دوڑتا ہوا مسجد میں گھس گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص کچھ خوف زدہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آپ کے پاس پہنچ گیا تو اس نے کہا خدا کی قسم میرا ساتھی قتل ہوگیا اور مجھے بھی قتل کردیا جاتا، اتنے میں ابوبصیر نے آکر عرض کیا، اے اللہ کے نبی خدا کی قسم آپ نے مجھے ان کی طرف واپس فرما کر اپنی ذمے داری پوری فرمادی۔ پھر اللہ نے مجھے ان سے نجات دے دی۔ آپ نے فرمایا افسوس یہ تو لڑائی کی آگ ہے، کاش کوئی اس کو (مکے) پہنچا دیتا۔ جب ابوبصیر نے آپ کی بات سنی تو وہ سمجھ گئے کہ آپ اس کو پھر مشرکوں کے پاس واپس کردیں گے، لہٰذا وہ وہاں سے نکل کر سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ ادھر ابوجندل بن سہیل بھی کفار سے چھٹکارا پاکر آرہے تھے، وہ بھی ابوبصیر سے مل گئے۔ پھر مشرکین میں سے جو شخص بھی مسلمان ہوکر مکے سے نکلتا وہ ابوبصیر سے مل جاتا، یہاں تک کہ ایک جماعت تیار ہوگئی۔ پھر جب وہ قریش کے کسی قافلے کے بارے میں سنتے کہ وہ شام جارہا ہے تو وہ اس کی گھات میں رہتے اور (موقع پاکر) اس کے آدمیوں کو قتل کردیتے اور ان کا مال لوٹ لیتے۔

یہ صورت حال دیکھ کر قریش نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی بھیجا اور آپ کو اللہ کا واسطہ دیا کہ آپ ابوبصیر کو منع کریں اور کہا کہ آئندہ جو بھی مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے وہ امن میں ہوگا، چناں چہ آپ نے ابوبصیر کو منع فرمادیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَهُوَ الَّذِی كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ (۴۰)

اور وہی تو ہے جس نے تمہیں مکہ شہر میں ان پر فتح یاب کرنے کے بعد ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے اور جو کچھ تم کرتے رہتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور یہ کافر وہی تو ہیں جنہوں نے انکار کیا اور تمہیں مسجد الحرام سے روک دیا اور قربانی کے جانوروں کو بھی ان کی جگہ پر پہنچنے سے روک دیا۔ (۴۱)

یہاں بھی ملاحظہ کیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر رحمت وشفقت کے باوجود محض معاہدے کی وجہ سے ان بے کس مسلمانوں کی مدد نہ کر سکے، اور بالآخر فتح مسلمانوں کی ہی ہوئی۔ انہیں صبر کا اجر ملا، اور مشرکین مکہ نے ازخود ان ہی مسلمانوں کو مدینہ منورہ کی ریاست کے دائرۂ اختیار میں لینے کی درخواست کردی، جنہیں وہ اس سے قبل مدینہ منورہ آنے سے روک رہے تھے۔ صبر اپنے جذبات کو ختم کرنے کا نہیں، خاص وقت تک اور مناسب موقع کے انتظار میں روک رکھنے کا نام ہے۔ یہی کامیابی کی کلید ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہمیشہ مثبت نکلتا ہے، اس کے نتیجے میں غیب سے ایسی صورت پیش آتی ہے کہ مسائل حل ہو جاتے ہیں، اور بند راستے خود بہ خود کشادہ نظر آنے لگتے ہیں۔

۳۰۔ ابن اسحاق ابن عباسؓ کی روایت سے فتح مکہ کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ مشرکین مکہ دارالندوہ کے پاس صف باندھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو دیکھ رہے تھے۔ جب آپ مسجد الحرام میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنی چادر اس طرح اوڑھی کہ اس سے آپ کا دایاں بازو کندھے تک کھل گیا پھر آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو کفار کے سامنے اپنی قوت کا اظہار کرے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکن یمانی کا استلام کیا اور رکن یمانی سے حجر اسود تک آپ نرم چال سے چلے (کیوں کہ وہاں سے کفار نظر نہیں آتے تھے) صحابہ کرامؓ بھی آپ کی اتباع کرتے رہے۔ پھر حجر اسود سے رکن یمانی تک پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی طرح قریب قریب قدم رکھ کر چلے اور طواف کے باقی چکروں میں نرم چال سے چلے۔ صحابہؓ کا گمان تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو دکھانے کے

لئے اسی سال ایسا کیا ہے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں بھی ایسا ہی کیا تو یہ طریقہ مسنون ہوگیا۔ (۴۲)

چناں چہ آج بھی ہر مسلمان جب زیارتِ بیت اللہ کے شرف سے سرفراز ہوتا ہے، اور اسے عمرے یا حج کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو وہ اس سنت کی ادائیگی ضروری تصور کرتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ اتباعِ نبوت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ یہ ایک سبق ہے کہ دین اتباعِ نبوت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہمارا حال سب سے جدا ہے، وہ سنتیں جن سے ہماری معاشرت ومعیشت متاثر نہیں ہوتی، جن کی زد ہماری رسوم ورواج پر نہیں پڑتی، انہیں کرنے میں تو ہیں کوئی تامل نہیں ہوتا، لیکن جن سنتوں سے ہماری روایت، رسوم ورواج اور معاشرت ومعیشت متاثر ہوتی ہے، وہاں ہمارے رویے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی دورنگی نے ہماری زندگی کو تقسیم کردیا ہے۔ سنت تو فقط اتباعِ نبوت کا نام ہے، اپنی پسند کو نبوت کے طریقے میں ضم کردینے کا نام ہے۔ یہ تو قربانی کا راستہ ہے، تفریح کا نہیں۔

۳۱۔ صلح حدیبیہ کی وجہ سے مسلمانوں کو یک سوئی حاصل ہوئی تو انہوں نے خیبر کا رخ کیا، یہ یہود کا گڑھ تھا، محرم ۷ھ میں انہوں نے مسلمانوں پر حملے کی تیاری شروع کردی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے ۱۶ سو صحابہ کے ساتھ خیبر کا رخ کیا۔ یہود وہاں تین بڑی قلعوں میں ۲۰ ہزار سپاہ کے ساتھ موجود تھے۔ مسلمانوں کو دیکھ کر قلعوں میں محصور ہوگئے، مسلمانوں نے پے در پے حملے کر کے سارے قلعے فتح کر لئے، آخری قلعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ (۴۳)

اب مسلمانوں کے انصاف کا ایک اور پہلو ملاحظہ کیجئے، فتح یاب ہونے کے بعد مسلمانوں نے یہود کی درخواست پر وہاں کی زمینیں بٹائی پر ان ہی کے پاس رہنے دیں۔ جب بٹائی کا وقت آتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمائندہ جا کر فصل کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان سے کہتا کہ جو حصہ چاہو لے لو تو یہود کہتے کہ زمین آسمان اسی انصاف پر قائم ہیں۔ (۴۴)

ایک طرف تو دیکھئے کہ یہود جیسی دشمن قوم کی ساتھ مسلمانوں کا رویہ اس قدر انصاف پسندانہ ہے کہ خود یہود کو بھی اعتراف ہے، اور دوسری جانب یہود جیسی قوم کے ساتھ انصاف کا یہ معیار پیش کرنے والی قوم آج اس عالم میں ہے کہ اس کے ہاتھوں خود مسلمان بھی محفوظ نہیں، نہ عزت وآبرو، نہ مال ودولت، نہ گھربار، کسی معاملے میں بھی کسی نے اپنے آپ کو قابل بھروسہ نہیں چھوڑا۔

۳۲۔ اسی مقام پر یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کھانے پینے کا سامان ایک ہی اونٹ پر تھا اور وہ اونٹ حضرت ابوبکرؓ کے غلام کے پاس تھا، عَرَج پہنچ کر وہ اپنے

غلام کا انتظار کرتے رہے، جب وہ آیا تو اس کے ساتھ اونٹ نہ تھا، پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ تو گزشتہ شب گم ہوگیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک ہی اونٹ تھا تم نے وہ بھی گم کردیا؟ پھر انہوں نے اپنے غلام کو مارنا شروع کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر تبسم فرمانے لگے اور فرمایا کہ اس محرم کو دیکھو کیا کر رہا ہے؟ (۴۵)

جب فضالہ اسلمی کی آل کو علم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زادِ راہ گم ہوگیا ہے تو وہ آپ کے لئے حیس (ایک قسم کا عمدہ میٹھا کھانا) لے کر آئے، اور آپ کو پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ آؤ ابوبکر اللہ تعالیٰ نے بہترین غذا مہیا فرمادی ہے، لیکن ابوبکرؓ اپنے غلام پر غصے ہو رہے تھے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ تسلی کرو ابوبکرؓ، کیوں کہ یہ معاملہ نہ تمہارے اختیار میں ہے نہ ہمارے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل نے وہ حیس تناول فرمایا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا، یہاں تک کہ سب سیر ہوگئے، اتنے میں صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے وہ (سامان کی رکھوالی کے لئے) قافلے کے پیچھے چلتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گم شدہ اونٹ ان کے پاس تھا اور اس پر سامان بھی موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کو کہا کہ کیا سامان موجود ہے؟ انہوں نے کہا کہ صرف ایک پیالہ غائب ہے۔ جس سے ہم پانی پیتے تھے، یہ سن کر غلام نے کہا کہ وہ پیالہ میرے پاس موجود ہے، اس کے بعد سعد بن عبادہ اور ان کے صاحب زادے قیس رضی اللہ عنہما ایک اونٹ لے کر آئے جس پر زادِ راہ بھی موجود تھا اور عرض کیا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کا سامان بردار اونٹ گم ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ اونٹ اس کی جگہ پیش خدمت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا اونٹ واپس کردیا ہے، تم اپنا اونٹ واپس لے جاؤ۔ اللہ تمہیں برکت عطا فرمائے۔ (۴۶)

اگر ضرورت کی کوئی چیز ہم سے لے لی جائے اور اس کے نتیجے میں کوئی ہمیں متبادل کی پیش کش کرے، پھر ہماری اصل چیز واپس مل جائے تو ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم اس پیش کش سے فائدہ اٹھائیں، کیوں کہ جس سبب سے وہ پیش کش کی گئی تھی وہ ختم ہو چکا ہے۔ سو وہ صورتیں ہمارے لئے کیسے درست ہوسکتی ہیں، جب ہمیں ضرورت کے لئے وسائل بھی میسر ہوں، پھر بھی ہم دوسروں کی جانب اس امید سے دیکھیں کہ وہ ہمیں کچھ عطا کریں گے؟

۳۳۔ غزوۂ خیبر ایک نہایت اہم غزوہ ہے، سیرت طیبہ کے حوالے سے اس کی اہمیت مسلم ہے، اس کے اثرات مسلمانوں پر کئی اعتبار سے پڑے، لیکن اس وقت اس غزوے میں پیش آنے والے ایک واقعے

کا بیان مقصود ہے۔ اہل خیبر کے یہاں کسی یہودی کا ایک سیاہ فام غلام تھا، (ان کا نام دوسری روایت میں اسود راعی بیان ہوا ہے) یہ غلام اس یہودی کے ریوڑ کی خدمت پر مامور تھا، جب غزوۂ خیبر کے موقع پر لڑائی کا موقع آیا اور اس نے دیکھا کہ سب یہودیوں نے ہتھیار سجا لئے ہیں اور جنگ کے لئے تیار ہیں تو اس نے پوچھا کہ کس سے لڑائی کی تیاریاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ہم ایک ایسے شخص سے لڑنا چاہتے ہیں جو نبوت کا دعوے دار ہے اس شخص نے جب یہ بات سنی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کا اشتیاق اس کے دل میں پیدا ہو گیا، وہ اپنا ریوڑ لے کر باہر نکلا، اور بھیڑ بکریاں چراتا ہوا مسلمانوں کے لشکر کے قریب آ گیا، مسلمانوں نے اسے دیکھا تو اسے پکڑ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، آپ ﷺ سے اس نے چند سوالات کئے، اس نے کہا کہ آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ادعوك الى الاسلام، الى ان تشهد ان لا اله الا الله وانى رسول الله، والا تعبد الا الله

میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تم یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

اس غلام نے عرض کیا کہ اگر میں یہ گواہی دے دوں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الجنة ان مت على ذلك

اگر تم ایمان لے آئے تو تمہیں جنت ملے گی۔

وہ شخص فوراً مسلمان ہو گیا۔

اسلام لانے کے بعد اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایسا شخص ہوں جس کی رنگت کالی ہے، چہرہ بدصورت ہے اور جسم سے یہ بو اٹھ رہی ہے، میرے پاس کچھ مال و دولت بھی نہیں، اگر میں ان یہودیوں سے جنگ کروں اور اس میں شہید کر دیا جاؤں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک، اس حبشی غلام نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہود کی بھیڑ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، میں ان کا کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں یہاں سے لے جاؤ اور قلعے کے پاس جا کر ان کو یہود کی بستی کی طرف ہنکا دو، یہ خود اپنے مالکوں تک چلی جائیں گی، اللہ تعالیٰ تمہاری امانت تمہاری طرف سے ادا فرما دے گا، چناں چہ اس غلام نے ایسا ہی کیا، رسول اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم اس کی امانت داری سے بہت متعجب ہوئے۔ بکریاں اپنے اپنے مالکوں تک پہنچ گئیں تو یہ شخص میدان عمل میں اترا اور یہود سے مقابلہ شروع کر دیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ یہ نومسلم سابقہ یہودی غلام حضرت اسود راعی رضی اللہ عنہ راہ خدا میں شہید ہو گئے، انہیں اسلام لانے کے بعد جہاں میں شرکت کے سوا کوئی دوسری عبادت ادا کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ مسلمان انھیں اٹھا کر اپنے لشکر میں لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں میرے خیمے میں لے آؤ، چناں چہ انہیں آپ ﷺ کے خیمے میں لایا گیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فراغت ملی اور اپنے خیمے میں تشریف لائے تو انہیں دیکھا اور ان کے پاس جا کر فرمایا:

لقد حسن الله وجهك وطيب ريحك و كثر مالك

اللہ تعالیٰ نے تمہارے چہرے کو خوب صورت بنا دیا ہے، تمہارے جسم کی بو کو خوش بو سے بدل دیا ہے اور تمہارے مال کو بڑھا دیا ہے۔

پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

میں نے دو حوروں کو دیکھا کہ وہ ان کے چہرے پر لگی ہوئی گرد و غبار کو جھاڑ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ جس نے تیرے چہرے کو غبار آلود کیا ہے اللہ اس کے چہرے کو خاک آلود کر دے اور جس نے تجھے شہید کیا ہے اللہ اسے ہلاک کرے۔ (۴۷)

حضرت اسود راعی نے اپنی جو تین کم زوریاں بیان کی تھیں ان تینوں خامیوں کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین خوبیوں سے بدل دیا، اور محض چند لمحوں میں وہ شخص یہود کے ایک معمولی سے حبشی غلام کی حیثیت سے اوپر اٹھ کر اتنی بڑی کام یابی و کام رانی سے ہم کنار ہو گیا۔ رضی اللہ عنہ۔ قربانی کا جذبہ اسی طرح سرعت اور تیزی سے کام یابی دلایا کرتا ہے۔

میدان جنگ میں یہود جیسی قوم کے مقابل عین لڑائی کی حالت میں امانت دیانت کا کس قدر بلند تصور رسول اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا، آج ہمارے جو رویے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اس مختصر سے واقعے میں سبق ہی سبق پوشیدہ ہیں۔ ذرا سی مخالفت پر ہم ہر طرح کے نقصان پہنچا دینے کو خالص اپنی ضرورت و حق تصور کرتے ہیں، یہ طریق کار اور رویہ سیرت طیبہ کی روشنی میں کیوں کر درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

۳۴۔ ہجرت مدینہ کے ساتویں سال رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ نے غالب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بنو عوال اور بنو عبد ثعلبہ کی جانب ایک سریہ روانہ فرمایا، اس سریے میں لڑائی کے دوران ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ایک شخص کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے

تو اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور وہ کہہ اٹھا کہ ''لا الہ الا اللہ'' مگر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوچ کر اسے قتل کر دیا کہ وہ صرف اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے، اس واقعے کی اطلاع اس سفر سے واپسی پر جب رسول اللہ ﷺ کو ہوئی، تو آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا:

الا شققت قلبه، فتعلم صادق هو ام كاذب؟ (۴۸)

تم نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا تا کہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنے اس قول میں سچا ہے یا جھوٹا؟

۳۵۔ اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آیا، انہوں نے بھی حالت جنگ میں کلمہ گو ہونے کا دعویٰ کرنے والے چند مسلمانوں کو غلط فہمی کی بنا پر قتل کرنے کا حکم دیا، رسول خدا نبی رحمت ﷺ کو اس امر کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا:

اللهم انی ابرأ اليك مماصنع خالد (۴۹)

اے اللہ! میں تیرے سامنے خالد کے فعل سے مکمل برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

درحقیقت ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہم صرف ظاہری حالت کو قبول کرنے کے مکلف ہیں، کسی کے دل کی کیا کیفیات ہیں؟ اس کے قول اور ایمان میں کس قدر تضاد ہے، یہ اس کا اور اس کے رب کا معاملہ ہے، ہمیں حکم یہی ہے کہ ہر معاملے میں خوش گمانی کا مظاہرہ کریں، ہر معاملے میں خوش فہمی کا اظہار کریں، مثبت پہلو سامنے رکھیں، روشن رخ کو دیکھیں اور اچھے پہلوؤں کو پھیلائیں، اور جہاں کہیں کوئی برا پہلو نظر آئے، کسی بات کے بارے میں یقین بھی ہو جائے کہ وہ غلط ہے، تب بھی اسے پھیلانے کا حکم نہیں، صرف کسی ایسے انداز میں اسے سمجھا دیا جائے جو اسے نہ تو برا محسوس ہو، نہ اس سے اس شخص کو ناگوار خاطر ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو خاموش ہو جائیں۔

ہم آج طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں، اور ہر ایک باطن میں جھانک لینے اور اسے اندر سے جان لینے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں، اس لئے ہمارے لئے ان واقعات میں کس قدر سامان نصیحت ہے، یہ محتاج بیان نہیں۔ سچ یہ ہے کہ بدگمانی دینی اعتبار سے بھی بری بات ہے، اور دنیاوی زندگی بھی اس کے ذریعے تلخ ہو جاتی ہے۔

۳۶۔ حضرت صخر رضی اللہ عنہ ایک عرب سردار ہیں، جب غزوۂ طائف ہوا تو اہل طائف کو مصالحت پر آمادہ کرنے میں ان ہی کی کاوشوں کا دخل تھا، ان کا یہ کارنامہ عہد نبوی کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے، اس اعتبار سے وہ خصوصی اعزاز کے مستحق تھے۔ لیکن ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ

عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی کہ ان کی پھوپھی حضرت صخر کے قبضے میں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سن کر فیصلہ فرمایا کہ انہیں نہ صرف چھوڑ دیں بل کہ انہیں ان کے گھر پہنچا کر آئیں۔

اس واقعے کے بعد بنوسلیم حضرت صخر کے بارے میں ایک اور شکایت لے کر آ گئے، شکایت یہ تھی کہ جس زمانے میں وہ ایمان نہ لائے تھے حضرت صخر رضی اللہ عنہ نے ان کے پانی کے چشمے پر قبضہ کرلیا تھا اور اب چوں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں اس لئے ان کا چشمہ انہیں لوٹا دیا جائے، یہ شکایت معقول تھی اور مبنی برحقیقت بھی، اس لئے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوسلیم کے حق میں فیصلہ فرمایا دیا اور حضرت صخر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرلیتی ہے تو وہ اپنے مال اور جان کی مالک ہو جاتی ہے، اس لئے ان کا چشمہ انہیں واپس کر دیا جائے۔

یہاں ہمارا مقصد اس جملے سے ہے، جو یہ قصہ بیان کرنے کے بعد راوی نے بیان کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں فیصلے اگر چہ حضرت صخر رضی اللہ عنہ کے خلاف ہوئے مگر انہوں نے بغیر کسی تذبذب کے دونوں کو قبول کرلیا، مگر جب انہوں نے دونوں فیصلے قبول کر لئے تو شرم کی وجہ سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا، راوی کے الفاظ یہ ہیں:

وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتغير عند ذلك حمرة حياء من اخذه الجارية واخذه الماء (۵۰)

صخر سے ان کی باندی واپس لینے کی اور پانی پر سے ان کا قبضہ ختم کرنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر شرم کی وجہ سے سرخی آ گئی۔

کیوں کہ حضرت صخر رضی اللہ عنہ اپنی سابقہ خدمات کی وجہ سے خصوصی رعایت اور امتیازی سلوک کے مستحق تھے، نہ کہ مقدمات میں مسلسل ان کے خلاف فیصلہ کیا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر شرم محسوس کی کہ وہ اسلامی حکومت کے لئے اس قدر اہم خدمت انجام دینے کے باوجود کسی اعزاز سے نوازے نہ جا سکے، الٹا انہیں اپنے خلاف دو فیصلوں کو قبول کرنا پڑا۔

لیکن اس کے باوجود انہیں سردار ہونے کی وجہ سے کوئی رعایت نہیں دی گئی، انہیں کسی استثنائی فائدے کے ذریعے سہولت نہیں پہنچائی گئی۔ انسانی مساوات کا یہ اصل روپ تھا۔ اسی مساوات نے امیر و غریب کی تفریق ختم کر کے ایک فلاحی انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی تھی، اور آج بھی دنیا اسی مساوات کی منتظر ہے۔ مگر اس کے اصل علم بردار یعنی مسلمان خود طرح طرح کی تفریقوں کا شکار ہو کر نبی رحمت صلی اللہ

علیہ وسلم کے پیغام سے دور ہو چکے ہیں۔

۳۷۔غزوۂ حنین کئی ایک اعتبار سے مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش ثابت ہوا، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مسلمانوں کی کثیر فوج بنو ہوازن کے تیراندازوں کی جانب سے تواتر سے پھینکے جانے والے تیروں کی بارش کے سبب تتر بتر ہوگئی، لیکن اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند جاں نثار صحابہ کے ساتھ بہ دستور میدان کارزار میں ڈٹے رہے، اور اپنے خچر کو ایڑ لگا کر برابر دشمن پر حملہ آور ہوتے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے ثابت میں ذرا برابر لغزش نہیں آئی، حضرت براء رضی اللہ عنہ بھی اس معرکے میں شریک تھے، ان سے کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ بھی اس معرکے میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر ثابت قدم رہے، وہ کہتے ہیں:

اشهد على نبى الله صلى الله عليه وسلم انه ماولى (۵۱)

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹھ نہیں پھیری۔

اور دوسری روایت میں حضرت براء رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ جب لڑائی شدید ہوتی تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی پہلو میں پناہ لیتے تھے، اور ہم میں سب سے بہادر اس شخص کو سمجھا جاتا تھا جو میدان کارگزار میں آپ کے پہلو میں کھڑے ہو کر داد شجاعت دے رہا ہوتا تھا۔ (۵۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے رحمت وتلطف کے واقعات تو کثرت سے بیان ہوتے ہیں، جو آپ کی زندگی کا مقصد اور آپ کی حیات کے بڑے حصے پر مشتمل ہے، مگر آپ کی شجاعت بھی عین حقیقت ہے، ضرورت کے وقت جذبوں کا اظہار اور شجاعت کا استعمال بھی عین کمال کی علامت ہے۔ حیات دینوی کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی، جب تک تمام انسانی صفات موجود نہ ہوں، رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے کمال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ میں تمام بشری اور انسانی صفات نہ صرف موجود تھیں، بل کہ ان کا اظہار بھی انتہائی بلند معیار پر ہوتا تھا۔

۳۸۔اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد آپ نے سب سے پہلے شہدائے احد کا ذکر فرمایا اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی۔ پھر مہاجرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تمہیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ میرے جسم و جان ہیں، انہوں نے اپنی تمام ذمے داریاں پوری کر دیں لیکن انہیں اس کا جو بدلہ (جنت) ملنا چاہئے تھا وہ ملنا ابھی باقی ہے۔ پس اور لوگ بڑھتے جائیں گے اور انصار کم ہوتے جائیں گے، اس لئے تم ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو، ان میں سے جو محسن اور نیکوکار ہو، اس کے ساتھ احسان کرو اور ان میں سے جو غلطی کرے اس سے درگزر کرو۔ (۵۳)

پھر فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس جو کچھ ہے اسے قبول کرے۔ (یعنی آخرت کی نعمتوں کو) لیکن اس بندے نے خدا ہی کے پاس کی نعمتوں کو قبول کرلیا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے، لوگوں کو تعجب ہوا کہ آپ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کر رہے ہیں یہ رونے کی کون سی بات ہے مگر راز دار نبوت سمجھ گئے تھے کہ وہ بندہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تقریر جاری رکھی اور مسجد کی طرف لوگوں کے جتنے دریچے کھلے ہوئے تھے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ابوبکرؓ کے دریچے کے سوا سب دریچے بند کر دیئے جائیں۔ جان و مال، محبت و رفاقت کے اعتبار سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والا ابوبکرؓ سے بڑھ کر میرا کوئی محسن نہیں۔ جس جس نے میرے ساتھ کوئی احسان کیا، میں نے اس کا بدلہ دے دیا، سوائے ابوبکرؓ کے کہ اس کا صلہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہی اس کو دے گا۔ اگر میں اپنے پروردگار کے سوا اپنی امت میں سے کسی کو اپنا دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا، لیکن دوستی کے لئے اسلام کا رشتہ جو سب سے افضل و برتر ہے کافی ہے۔ (۵۴)

اس خطبے میں کئی نکات قابل غور ہیں۔

الف: ہم عام طور پر اچھا وقت آنے پر اپنے محسنوں کو بھول جاتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادمِ آخر انصار کو یاد رکھا اور رخصت ہوتے ہوئے بھی ان کے حقوق کی یاد دہانی کرانا اپنی ذمے داری تصور کیا۔

ب: پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام اور مرتبہ ملاحظہ کیجئے کہ وہ محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے ایک جملے سے وہ مفہوم جان گئے، جو دیگر صاحبِ فہم و فراست حضرات بھی اس وقت نہ جان سکے۔ نبوت کی جانشینی کے لئے یہی فہم و فراست درکار ہے۔

ج: یہی سبب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جانشینِ نماز بنا کر ان لوگوں کے لئے سوچنے اور غور کرنے کا ایک نکتہ عطا فرما دیا، جنہیں اس باب میں کوئی تامل تھا۔ باقی امت کو اس بارے میں کبھی کوئی اشکال پیش ہی نہیں آیا۔ وہ سب تو اس امر سے بہ خوبی واقف تھے کہ اس ذمے داری کے اولین اہل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

۳۹۔ عبداللہ ابن ابی حمسا رضی اللہ عنہ ایک صحابی رسول ہیں، ان سے رسول اکرم ﷺ کے زمانہ قبل از بعثت سے تعلقات تھے، ان کا ایک واقعہ ہے۔ بعثت مبارکہ سے قبل آپ ﷺ نے ان سے خرید و

فروخت کا کوئی معاملہ کیا، عبداللہ بن ابی حمسا کے ذمے کچھ ادائیگی باقی تھی، انہوں نے کہا کہ میں گھر سے لے کر آتا ہوں، آپ یہیں ٹھہریئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں ٹھہر گئے، مگر حضرت عبداللہ گھر جا کر اپنا وعدہ بھول گئے، تین روز بعد انہیں یاد آیا، وہ اس جگہ پر پہنچے تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انتظار میں اسی جگہ کھڑے ہیں، آں حضرت ﷺ نے اس قدر تاخیر کے باوجود ان سے صرف اس قدر فرمایا:

یا فتی لقد شققت علی، انا ھھنا منذ ثلاث انتظرتك

اے نوجوان! تم نے مجھے سخت مشقت میں ڈال دیا، میں تو تین روز سے تمہارا یہیں انتظار کر رہا ہوں۔ (۵۵)

زبان کی اہمیت اور ایفائے عہد کی عملی تلقین اس سے بہتر انداز میں کیسے ہو سکتی ہے؟

۴۰۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے آں حضرت ﷺ سے حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بہت برا آدمی ہے، پھر آپ نے اسے حاضری کی اجازت دے دی اور اس کے اندر آنے پر اس کے ساتھ نہایت نرمی سے باتیں کیں، جب وہ شخص چلا گیا تو میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس کے بارے میں یہ کچھ ارشاد فرمایا تھا، مگر پھر آپ نے اس سے اس قدر نرمی کے ساتھ بات چیت کی، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

یا عائشة ان من شر الناس من ترکه الناس او ودعه الناس اتقاء فحشه (۵۶)

اے عائشہ! لوگوں میں سے بدتر شخص وہ ہے، جسے لوگ اُس کی بدکلامی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

اس واقعے سے ہمیں کئی سبق ملتے ہیں، مثلاً ایک تو یہی کہ بدکلامی ایسی ناپسندیدہ اور مکروہ صفت ہے، جسے خصوصاً ایک بندۂ مؤمن کو کسی صورت میں بھی اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان کو ایسے لوگوں کے ساتھ بھی نرم گفتاری کا مظاہرہ کرنا چاہئے جن کو وہ بہ وجوہ پسند نہیں کرتا، یا جن سے اسے شکایت ہے۔ کسی بھی شخص کی ہم سے بداخلاقی کی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ مومن کامل سے اسلام کا یہ بنیادی مطالبہ ہے۔

۴۱۔ طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب سرزمین عرب کو اسلام کی ضیا پاش کرنیں منور کرنے لگیں، تو ہم چند افراد پر مشتمل قافلہ ربذہ سے نکلے اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچے تو وہیں پر قیام کیا، ہم وہیں بیٹھے تھے کہ ایک سفید پوش نیک صورت صاحب آئے، خیریت معلوم کی، ہم نے سلام کا جواب دیا،

ہمارے پاس سرخ رنگ کا ایک اونٹ تھا، اس کی قیمت معلوم کی، ہم نے جواب دیا کہ اس قدر کھجور کے بدلے میں لے سکتے ہیں، انہوں نے کچھ بھاؤ تاؤ اور مول تول نہیں کیا، ہماری بتائی ہوئی قیمت قبول کر لی اور اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے لے کر شہر کی طرف چلے، اور بالآخر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جب آپ واپس جا چکے تو ہم لوگوں کو احساس ہوا کہ دام تو لئے نہیں اور ہم انہیں پہچانتے بھی نہیں، اس لئے دام تو گئے، اب لوگوں نے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا شروع کیا اور عام رواج کے مطابق صورت حال کی ذمے داری ایک دوسرے پر ڈالی جانے لگی۔ ایسے میں ایک محمل نشین، پردہ دار خاتون بولیں کہ مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کے مانند اس قدر روشن نہیں دیکھا، یعنی ایسے شخص کے بارے میں بدگمانی درست نہیں، یہ شخص کوئی دغا نہیں کر سکتا۔ رات ہوئی تو اس خاتون کا دعویٰ درست ثابت ہو گیا، ایک شخص آیا اور اس نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لئے کھانا اور کھجور بھیجی ہیں، دوسرا دن ہوا، صبح کے وقت ہم لوگ شہر مدینہ میں داخل ہوئے اور مسجد نبوی پہنچے اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے اور خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک انصاری صحابی اٹھے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ لوگ قبیلہ بنو ثعلبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے جد اعلیٰ نے ہمارے خاندان کے ایک فرد کو قتل کر دیا تھا، اس کے بدلے میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے، نبی رحمت ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔ (۵۷)

مومن کی علامت یہی ہے کہ وہ اپنے عمل، چہرے بشرے، رویے اور رہن سہن سے پہچانا جاتا ہے، اسے زبان سے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کا کردار بتاتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور کس منبع حکمت وفضیلت کا فیض یافتہ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

۴۲۔ امیر المؤمنین خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمات اور مقام ومرتبے سے کون واقف نہیں؟ ان ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کے ایک قریبی عزیز منافقین کی سازش کا شکار ہو گئے اور نادانستگی میں ایک ایسی عظیم غلطی سرزد ہوئی کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے بارے میں بدگمانی پیدا ہو گئی، واقعہ افک کا ذکر ہے۔ چوں کہ اس واقعے سے بہ راہ راست متاثر ہونے والوں میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اور وہ اپنے ان عزیز کی کفالت بھی کرتے تھے، اس لئے ان کا رنج وغم فطری تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ اب میں ان کی کفالت نہ کروں گا۔ یہ واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ اور قرآنی احکام کا ایک حصہ بن گیا ہے اور اس طرح کہ آج قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے سامنے جب یہ آیت کریمہ آتی ہے، جو آگے بیان ہو رہی ہے، تو اس

واقعے کی پوری تاریخ اس کے سامنے پھر جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قسم اٹھانے کے بعد قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کی جانب سے حکم نازل ہوا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (۵۸)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل وقدرت ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتے داروں، مساکین اور مہاجرین فی سبیل اللہ کی مدد نہیں کریں گے، انہیں تو معاف کر دینا چاہئے اور درگزر سے کام لینا چاہئے، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے اور اللہ تو غفور ورحیم ہے۔

یہ بات جرم ثابت ہونے کے بعد کی ہے، جن کی سفارش قرآن کر رہا ہے، بل کہ جن کی بنیاد پر صدیق اکبر کی سرزنش قرآن کر رہا ہے، ان پر جرم ثابت ہو چکا ہے، اس کے باوجود کفالت کے باب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے قبول نہیں کیا گیا، بل کہ انہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کا حکم ہوا۔ آج ہمارے ہاں رفاہی کام بھی ٹکروں میں بٹ چکے ہیں، مذہبی ومسلکی عرفتیں غریب ونادار کی کفالت کے راستے میں بھی حائل ہو چکی ہیں، ایسے میں یہ ہدایت، یہ قرآنی آیت اور اس کا پس منظر وشانِ نزول ہمارے لئے درس سیرت بھی ہے اور موجب ہدایت بھی۔

۴۳۔ ایک بار ایک صحابی رسول ﷺ نے شادی کی، ولیمے کے لئے گھر میں کچھ سامان نہ تھا، رسول خدا ﷺ کو علم ہوا تو فرمایا کہ جاؤ اور عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے آٹا مانگ لاؤ، وہ گئے اور آٹا لے آئے۔ راوی کا بیان ہے کہ کاشانہ نبوت میں اس روز اس آٹے کے علاوہ شام کو کھانے کو کچھ نہ تھا۔ (۵۹) اور وہ بھی ایک ضرورت مند کو دے دیا گیا تھا۔

قیادت صرف اراکین جماعت سے کام لینے کا نام نہیں ہے، ان کی ضرورتوں کی کفالت بھی قیادت ہی کی ذمے داری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا:

سید القوم خادمهم

قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے۔

تو اس کا مفہوم واضح تھا، اور یہاں تو اس کا اعلیٰ ترین مظاہرہ امت کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، کہ

اسی کے مقابل کوئی دوسری مثال سوچی بھی نہیں جاسکتی کہ اپنی ضرورت کا آٹا اپنے ساتھی کو دے کر اس کا دسترخوان سجایا جارہا ہے اور خود فاقے پر مطمئن ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

۴۴۔ ایسے ہی ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار ایک غفاری قبیلے کا شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آکر مہمان ہوا، اس رات کاشانہ نبوت میں رات کے کھانے کی جگہ صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ ﷺ نے اس مہمان کی نذر کردیا اور نبی رحمت کے ہاں اس رات فاقہ رہا، ہمارے لئے مقام تفکر یہ ہے کہ اس سے پہلی شب میں بھی خانہ نبوت میں فاقہ ہی تھا۔ (۶۰)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انداز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج وطبیعت کا حصہ تھا، کوئی ایک دو بار کی بات نہ تھی۔

۴۵۔ ایثار کی ایک اس سے بھی بڑھ کر اعلیٰ قسم ہے کہ انسان اپنے اہل خانہ اور قریبی متعلقین کی جائز ضرورتوں پر عام لوگوں کی ضرورتوں کو ترجیح دے، نبی اول وآخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کے نہایت بلند عملی نمونے ملتے ہیں۔ اسی نوعیت کے دو واقعے ابھی پیش کئے جاچکے ہیں، ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی امر کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست رد کردی اور فرمایا:

لا اعطیکم و ادع اهل الصفة، تلوی بطونهم من الجوع (۶۱)

یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تم کو تو دے دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں۔

ایثار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور واقعات بھی گزر چکے، مگر یہاں یہ نکتہ خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی درخواست خود بھی قابل توجہ تھی کہ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں بھی جلیل القدر صحابی رسول تھے، مگر یہاں ان کی درخواست سے بہ راہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا فائدہ اٹھاتیں، وہ اس لئے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم جو پوری امت، پوری انسانیت کے لئے سراپا رحمت وشفقت تھے۔ اپنی لخت جگر کو صفہ کے نادار صحابہ ترجیح نہیں دیتے۔ اختیار ملنے کے بعد ایثار کا اس قدر بلند معیار آج پوری امت کے لئے مینارہ نور بھی ہے، اور خود احتسابی کا درس بھی۔

۴۶۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے ہم راہ آپ ﷺ سے درخواست کی کہ فاطمہ کے چکی پیتے پیتے اور آٹا گوندھتے گوندھتے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔

حالیہ غزوے کے مال غنیمت میں جو لونڈیاں آئی ہیں، ان میں سے ایک دو مل جائیں۔ باوجودے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ آپ کی صاحب زادی کس حالت اور فاقہ کشی و تنگ دستی کی کس کیفیت سے دوچار ہیں، مگر آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول نہیں فرمائی، اور فرمایا:

واللہ لا اعطیکما وادع اهل الصفة تطوی بطونهم، لا اجد ما انفق علیهم، ولکنی ابیعهم وانفق علیهم اثمانهم (۶۲)

خدا کی قسم میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں کیسے دے دوں، حالانکہ اہل صفہ بھوکے بیٹھے رہیں۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان پر خرچ کر سکوں، لیکن میں ان غلاموں کو بیچوں گا اور ان کی رقم اہل صفہ پر خرچ کروں گا۔

اس واقعے میں اوپر بیان شدہ حقیقت مزید وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آگئی ہے۔

۴۷۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر خدمت ہوا، اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) مجھ میں چار برائیاں پائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں اور چوتھی برائی مجھ میں یہ ہے کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے آپ فرمائیں کہ کون سی برائی ترک کردوں؟ اب چاروں گناہ اس نوعیت کے تھے کہ کسی کے لئے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس گناہ کو جاری رکھو، لیکن نبی رحمت ﷺ نے اب ایسا پُر حکمت جواب عطا فرمایا کہ اس شخص کو اپنی اس شخص کو اپنی تمام برائیوں سے چھٹکارا مل گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ چوں کہ آپ سچ کی تاثیر سے واقف تھے، اس لئے آپ نے دوسرے تمام گناہوں پر اسے ترجیح دی، چناں چہ اس شخص نے عہد کیا کہ میں اس بات پر قائم رہوں گا اور آیندہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔

جب رات ہوئی تو اس کے دل نے حسب عادت شراب پینے کی خواہش ظاہر کی، پھر بدکاری کا خیال آیا، مگر پھر اسے خیال گزرا کہ اگر صبح کو رسول اللہ ﷺ نے پوچھ لیا کہ رات کو شراب پی تھی یا بدکاری کی تھی؟ تو کیا جواب دوں گا؟ اگر اقرار کروں گا تو شراب پینے اور زنا کی سزا دی جائے گی، اور اگر انکار کر دیا تو یہ عہد کے خلاف ہوگا اور میں جھوٹ کا ارتکاب کروں گا، جس کو ترک کرنے کے وعدہ کر چکا ہوں۔ یہ سوچ کر اس رات وہ شخص ان دونوں گناہوں سے باز رہا، پھر رات گئے چوری کا خیال آیا تو پھر یہی فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر صبح کو رسول اللہ ﷺ نے چوری کی بابت سوال کر لیا تو کیا جواب دوں گا؟ اگر جواب اثبات میں ہوا تو چوری کی حد نافذ ہوگی اور اگر اپنے جرم سے مکر گیا تو یہ عہد کے خلاف ہوگا، نتیجتاً اس گناہ سے بھی باز رہا۔ صبح کے وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ!

میں جھوٹ نہ بولنے کی وجہ سے اپنی بقیہ دیگر بدعات سے بھی چھٹکارا پا گیا، آپ ﷺ یہ سن کر خوش ہوئے۔(۶۳)

صرف یہی واقعہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت دعوت وتبلیغ سے کام کر کے بہت سے مواقع پر بہت سے انسانوں کے لئے سامانِ ہدایت بہم فرمایا، اور ہمارے لئے دعوت وارشاد کے راستے کشادہ فرمادیئے۔ آج ہماری ذمے داری ہے کہ مخاطبین کی صلاحیتوں اور ضرورتوں کو دیکھ کر اور ماحول کی رعایت رکھتے ہوئے پیغامِ اسلام کی تبلیغ وترویج میں اپنا حصہ شامل کریں۔

۴۸۔ ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے گھر میں آرائش کی غرض سے پردے لٹکا لئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو پردے دیکھ کر گھر میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی سے واپس لوٹ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے، جب وہ گھر آئے تو انہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس واقعے سے آگاہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور گھر میں داخل نہ ہونے کی وجہ دریافت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وما انا والدنیا وما انا والرقم ؟

مجھے دنیا سے کیا تعلق؟ مجھے دنیاوی نقش ونگار (اور زیب وزینت) سے کیا علاقہ؟

پھر جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس پردے کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ پردے فلاں کو دے دو۔(۶۴)

درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم آپ کی طبعی سادگی اور تکلف سے یک سر آزاد اندازِ زیست کے سبب سے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر معاملے میں تکلفات سے دور رہتے اور سادگی کو پسند کرتے تھے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ ہمیں اس باب میں ان گنت اہم اور ہماری موجودہ روش سے بالکل متضاد مظاہر حیات سے متعارف کرواتا ہے۔

یہ سب چیزیں جائز ہیں، اسی بنا پر آپ نے پردے ضائع کرنے کا حکم نہیں فرمایا، بل کہ فرمایا کہ فلاں کو دے دو۔ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم آل نبوت کو ان دنیاوی علائق سے پاک دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے جائز چیزوں کا استعمال بھی ان کے لئے پسند نہیں فرمایا۔ سو وہ چیزیں جو واضح طور پر ناجائز ہیں، آخر ہمارے لئے کیسے جائز ہوسکتی ہیں؟ رخصت وعزیمت کا درس دہراتے ہوئے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل بھی ہمہ وقت اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۴۹۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

کہ ایک مرتبہ میں آں حضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، آپ جہاں اور جس صورت میں قیام فرما تھے، وہاں کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ جسمِ مبارک پر صرف ایک تہبند تھا، ایک کھری چارپائی تھی۔ سرہانے ایک تکیہ پڑا تھا، جس میں خرمے کی چھال بھری ہوئی تھی، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، ایک کونے میں پائے کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی تھی، کچھ مشکیزے کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی تھیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ چٹائی پر قیام فرما تھے، جس کا اثر آپ کے جسمِ مبارک پر نظر آ رہا تھا، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

آں حضرت ﷺ نے مجھے روتے دیکھ کر میرے رونے کا سبب دریافت فرمایا! میں نے عرض کیا:

یا رسول اللہ ان کسریٰ و قیصر فیما ھما فیہ وانت رسول اللہ؟

یا رسول اللہ ﷺ! قیصر و کسریٰ کی حالت تو آپ کے سامنے ہے، اور آپ کے سامانِ خانہ کی یہ کیفیت ہے۔

ارشاد ہوا:

اما ترضیٰ ان تکون لھما الدنیا ولك الآخرۃ؟

(اے ابنِ خطاب)! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ وہ یہ دنیا حاصل کریں اور ہم آخرت میں سے حصہ پائیں۔ (۶۵)

حقیقت یہی ہے کہ اگر انسان کی نظر آخرت پر ہو تو یہ عارضی طمطراق اس کی نظروں کو خیرہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر انسان ان الائشوں سے دامن بچالے تو انسانی معاشرے میں بدعنوانی کا ہر دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔

۵۰۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گیا، جس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیزے سے اسے زخم آ گیا اور اس کا چہرہ زخمی ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدلہ لینے کی فوراً پیش کش کر دی، اگر چہ اس نے معاف کر دیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ نہیں سمجھا۔ اسی طرح اس دنیا سے پردہ فرمانے سے قبل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار مجمع عام میں یہ اعلان فرمایا کہ اگر کسی کا کوئی حق یا رقم وغیرہ میرے ذمے ہے تو وہ حاصل کر لے یا معاف کر دے، اس کے جواب میں صرف ایک شخص نے محض چند درہموں کا ذکر کیا، جس کی ادائیگی کے لئے آپ ﷺ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، جنہوں نے فوراً ادائیگی کر دی۔ (۶۶)

رسول اللہ علیہ وسلم کو جو مقام حاصل تھا، پھر صحابۂ کرام جس محبت اور شیفتگی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا سے محظوظ ہوتے تھے، اس ماحول میں آپ سے بدلہ لینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، مگر آپ نے امت کو اپنے عمل سے تلقین فرمادی کہ اسلام میں کسی شخصیت کو کوئی استثنا حاصل نہیں ہے، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔

۵۱۔ ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے کپڑے میلے تھے، نبی کریم نے سوال کیا کہ کیا تم مال دار ہو؟ صحابی رسول رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جی ہاں! آپ ﷺ نے ان سے ان کے مال کی تفصیل دریافت کی، انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ، بکریاں، گھوڑے، لونڈیاں اور غلام غرض ہر طرح کے مال و دولت سے نوازا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

فاذا اتاك الله مالا فلير اثر نعمة الله عليك و كرامته (٦٧)

جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت سے نوازا ہے، تو اس کی عطا فرمودہ نعمت اور عزت کا اثر بھی تم پر نظر آنا چاہئے۔

مال و دولت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور ہر نعمت کا شکریہ بھی ہے کہ اس کا مثبت اظہار بھی کیا جائے، اگر بولنے والا شخص بلا سبب خاموش رہے، لکھنے والا تحریر سے احتراز برتے اور عالم علم کو اپنی ذات تک محدود کرلے تو یہ ناشکری کی ہی ایک قسم ہے۔ مال دار شخص کو بھی اپنا انداز زیست ایسا رکھنا چاہئے کہ وہ دیکھنے میں دوسرے انسانوں کو ضرورت مند نظر نہ آئے، اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا اظہار ہو سکے، ہاں نمائش، دکھلاوے اور تکبر سے بچنا لازم ہے۔

۵۲۔ اسی طرح ایک صحابی کو رسول خدا ﷺ نے اس حالت میں دیکھا کہ ان کا حلیہ پراگندگی کا شکار تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا:

اما كان هذا يجد ما يسكن به شعره

اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ سر کے بال درست کرلے۔

اسی طرح اس کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا:

اما كان هذا يجد مايغسل به ثوبه (٦٨)

کیا اسے پانی نہیں ملتا کہ وہ اپنے کپڑے ہی دھولے۔

دین داری کا یہ تصور ہندوؤں اور عیسائوں کا تو ہے، مسلمانوں کے ہاں ہرگز نہیں کہ انسان گندگی میں لتھڑا رہے اور پراگندگی کا شکار نظر آئے۔ اگر انسان مالی اعتبار سے کم زور بھی ہو، تب بھی کم از کم وہ اس

قدر اہتمام تو کر ہی سکتا ہے کہ وہ اپنے کپڑے صاف ستھرے اور جسم پاک صاف رکھے۔ اس واقعے میں یہی تلقین فرمائی گئی ہے۔

۵۳۔ ایک سفر کا واقعہ ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں کسی پڑاؤ پر کھانے کا وقت ہوا ایک صحابی نے بکری ذبح کی اور کھانا تیار کرنے کے تمام کام آپس میں تقسیم کر لئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ تمام کام ہم انجام دے لیں گے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قد علمت انکم تکفونی، ولکن اکرہ ان اتمیز علیکم، فان اللہ یکرہ من عبدہ ان یراہ متمیزاً بین اصحابہ (۶۹)

میں جانتا ہوں کے تم یہ کام کر سکتے ہو مگر مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں تم سے ممتاز ہوں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ اپنے ساتھیوں میں اپنے آپ کو ممتاز دیکھنا چاہے۔

ظاہری ٹھاٹھ باٹھ، پروٹوکول اور دوسروں سے امتیاز، آج قیادت ہو یا عوام، پھر عرف عام میں دین دار طبقہ ہو یا دین دار سب کا یہی طریقہ اور یہی خواہش ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرما رہے ہیں اور اپنے عمل سے بھی اس کی نفی فرما رہے ہیں۔

۵۴۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی واقعہ نہیں تھا، بل کہ آپ صلی اللہ علہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا ایسے ان گنت مواقع سے آشنا ہوتا ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام خود اپنے دستِ مبارک سے انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے متعدد صحابہ کرام سے روایت ہے کہ

کان یخدم نفسہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امور اپنے ہاتھ سے نمٹایا کرتے تھے۔

چناں چہ جب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور گھریلو رہن سہن کی بابت پوچھا گیا تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگا لیا کرتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا سلف لے آتے، اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے گانٹھ لیتے، ڈول میں ٹانکے لگا لیتے، اونٹ کو اپنے

ہاتھ سے باندھ دیتے، اس کو چارا ڈال دیتے اور غلام کے ساتھ مل کر آٹا بھی گوندھ لیتے تھے۔(۷۰)

بڑا انسان وہ نہیں ہوتا جو بڑے جاہ وچشم سے رہتا ہو، جس کے ساتھ نوکر چاکر کی فوج ہو، بل کہ انسان بڑا اپنی سوچ، فکر، خدمت اور انداز زیست سے بنتا ہے۔

۵۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مقام اور ہر جگہ پر صحابۂ کرامؓ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے کہ کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا، اور آپ اپنے لئے کسی قسم کا کوئی امتیاز پسند نہیں فرماتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ انصاری جنہوں نے اس سے قبل آپ ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی آپ کو پہچان نہیں سکے تھے اور وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ سمجھ کر انہیں سلام کرنے لگے، یہاں تک کہ آپا پر دھوپ آ گئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ پر اپنی چادر سے سایہ کرلیا، اس وقت لوگوں کو علم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔(۷۱)

اس واقعے سے سب سے پہلا سبق ہمیں جو ملتا ہے، وہ یہ کہ امیر کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو جسمانی یا ذہنی کسی سطح پر بھی مامورین سے بہتر نہ سمجھے اور خود کو ان سے کسی بھی سطح پر ممتاز کرنے اور نمایاں ہونے کی کوشش نہ کرے۔

دوسرا درس اس میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ انسان خواہ کس قدر ہی بلند و بالا مرتبے کا حامل کیوں نہ ہو جائے اپنے کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں نہ کوئی عار ہے نہ اس سے حیثیت (اسٹیٹس) کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، نہ اس سے اس کی شان میں کسی قسم کی کوئی کمی آتی ہے، بل کہ دیکھا جائے تو اپنے ہاتھ سے اپنے کام کی انجام دہی خود اس کی شخصیت کو بلند کرتی ہے اور اس کے مراتب میں عنداللہ اور عندالناس اضافہ ہی ہوتا ہے۔

اس لئے اگر انسان کسی مقام پر پہنچنے کے بعد بھی اگر اپنا سامان خود اٹھالیا کرے، اپنے روزمرہ کے امور بغیر کسی عار کے خود انجام دے لیا کرے، اپنا سودا سلف خود لانے میں کوئی تامل نہ ہو، اسے اپنا بریف کیس خود اٹھانے میں کوئی شرمندگی محسوس نہ ہوتی ہو، اور اپنا قدم آگے بڑھا کر عام انسانوں کی طرح اپنا جوتا اپنے پاؤں میں خود ڈال لینے میں اسے کسی قسم کی تحقیر کا احساس نہ ہوتا ہو تو اس سے اس کی شخصیت کا تاثر کم زور نہیں پڑے گا، اس کا مقام کم نہیں ہوگا اور نہ اس کے مرتبے میں کسی طرح کی کوئی کمی آئے گی۔ سیرت طیبہ کا یہی درس ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمیں یہی سکھاتا ہے۔

۵۶۔ ایک بار ایک شخص ملنے کے لئے آیا۔ اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ وہ کانپنے لگا۔ آپ

ﷺ نے فرمایا:

هون عليك، فانما انا ابن امرأة من قريش كانت تاكل القديد (۷۲)

گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔ جو سوکھا گوشت پکا کر کھاتی تھی۔

اس طرح کے جملوں سے آپ ﷺ درحقیقت اس امر کی جانب امت کی توجہ مبذول کرانا چاہتے تھے کہ یہ دنیا ایک نظام کے تحت چل رہی ہے اور اس کا کنٹرول خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ باقی ساری دنیا اس کی مخلوق ہے سارے انسان اس کے بندے ہیں اور اپنے ہر ہر عمل میں اس کے سامنے جواب دہ ہیں، نیز مرنے کے بعد انسان کا سلسلہ حیات منقطع نہیں ہوتا، ہاں اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، صرف ایک محدود مدت کے لئے انسان پردۂ کائنات سے ہٹ جاتا ہے، اس وقفے کو اس مدت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جب طالب علم امتحان دینے کے بعد نتیجے کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس لئے مجھ سے خوف مت کھاؤ، مجھے تم تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے، تمہیں خوف زدہ کرنے کے لئے نہیں۔ یہ رحمت وتلطف ہی دعوت اسلام کی بنیاد ہے۔

۵۷۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روز قیامت کو اللہ کے دربار میں ہونے والے حساب کتاب کی منظر کشی فرمائی، اس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

روزِ قیامت جب اللہ تعالیٰ کا دربار آراستہ ہوگا اور انصاف کا آغاز ہوگا، تو سب سے پہلے ان لوگوں کو پیش کرنے کا حکم ہوگا، جو قرآن حکیم کے عالم تھے، پھر وہ پیش ہوں گے جو جہاد میں مارے گئے تھے، پھر اہل دولت وثروت پیش ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے سوال کرے گا کہ کیا میں نے تمہیں وہ سب کچھ نہیں سکھایا، جو میں نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا؟ تو تم نے اس پر کس قدر عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ، میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، اللہ تعالیٰ کہے گا تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو یہ سب اس لئے کرتا تھا کہ لوگ کہیں کہ یہ بڑا عالم ہے، تو دنیا میں تجھے یہ سب کچھ کہا جا چکا ہے۔ (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا ہے) پھر دولت مند سے اللہ فرمائے گا کہ کیا میں نے تیرے لئے دنیا کو کشادہ نہیں کر دیا تھا؟ یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہیں رہا، وہ عرض کرے گا کہ کیوں نہیں اے میرے رب، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ میں نے تجھے

جو کچھ دیا اس کا تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں حق داروں کو ان کا حق دیا کرتا تھا اور خیرات کیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹا ہے۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہوگا کہ تو یہ سب اس لئے کرتا تھا وہ لوگ تجھے بڑا سخی کہیں، تو یہ سب تجھے دنیا میں کہا جا چکا (یعنی تو بھی دنیا میں بدلہ پا چکا، اب آخرت میں تیرا کوئی حصہ نہیں) اس کے بعد جہاد میں شہید ہونے والے شخص کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو کس بات کی خاطر مارا گیا؟ وہ کہے گا کہ تیرے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے میں لڑا، یہاں تک کہ تیری راہ میں میں شہید ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے کہ یہ جھوٹا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، تو دنیا میں تجھے یہ سب کہا جا چکا (تو بھی اپنا بدلہ دنیا میں پا چکا) پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (۷۳)

اس تفصیلی روایت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک سے ہمیں بنیادی سبق یہ ملتا ہے کہ اعمال کی افادیت رضائے الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، اعمال دیکھنے میں خواہ کتنے ہی خوش نما کیوں نہ ہوں، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر نہیں کئے جا رہے ہیں، تو وہ نہ صرف بے روح ہیں بل کہ ان کی افادیت بھی سامنے نہیں آسکتی۔ دنیاوی اعتبار سے اگر اس سے وقتی طور پر کچھ فوائد حاصل ہو جائیں تو اور بات ہے، دائمی اور اخروی فوائد کی امید رکھنا ایسی صورت میں کارِ عبث ہے، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اگر ہم ان لحاتی، محدود اور وقتی فوائد پر ہی قناعت و اکتفا کر جائیں تو ہمارا ایمان کیوں کر کامل ہوسکتا ہے؟

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اعمال کی افادیت کا تعلق نیت سے ہے، اور نیت دل کا وظیفہ ہے، جس سے صرف خالق کائنات ہی واقف ہوسکتا ہے، کسی اور پر اس کا راز ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس باب میں کسی قسم کی چالاکی اور عیاری کام نہیں آسکتی، کام جس ذات کے لئے کیا جا رہا ہے، اس پر سب عیاں ہے، اسے سب کچھ معلوم ہے، ایسے میں محض دکھلاوے کے لئے یا کسی دنیاوی غرض سے کوئی کام سرانجام دینا کیسے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے؟

یہ پوری روایت درحقیقت ہمارے آج کے اعمال کا اشاریہ ہے، ہماری پوری دل چسپی اچھے کاموں کا بھی پورا بدلہ دنیا ہی میں حاصل کرنے میں ہے، ہماری ساری تگ و دو کا حاصل یہی نظر آتا ہے۔

۵۸۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان سے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے استفسار کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ اطلاع صحیح ہے کہ تم دن بھر روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فلا تفعل، صم وأفطر وقم ونم، فان لجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقا وان لزوجك عليك حقا وان لزورك عليك حقا، وان بحسبك ان تصوم كل شهر ثلاثة ايام فان لك بكل حسنة عشر امثالها

ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو (یعنی مسلسل روزے رکھنے کی بہ جائے درمیان میں وقفہ کیا کرو) نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو کیوں کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تم سے ملاقات کرنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ ہر ماہ تین روزے رکھ لیا کرو، کیوں کہ تمہیں ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا اور اس طرح تمہاری ساری عمر روزے میں شمار ہوگی۔

عبادت رب کا حق ہے اور انسان کی معراج بندگی میں اور عبادت میں مصروف رہنے میں ہے، لیکن عبادت کے مفہوم میں زندگی کے وہ امور بھی شامل ہیں، جن کی تلقین اسلام نے ہی کی ہے، انہیں نظر انداز کر کے اسلامی احکامات کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

۵۹۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لیکن میں نے اپنے اوپر سختی چاہی سو مجھ پر سختی کر دی گئی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اپنے اندر اس سے زیادہ کی قوت پاتا ہوں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھا کرو اور اس سے آگے نہ بڑھو۔ میں نے پوچھا کہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ کس نوعیت کا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ اسی طرح دوسری روایت میں یہ اضافہ بھی منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ماہ میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا کرو، مگر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا پھر تین روز میں ایک قرآن ختم کیا کرو۔ راوی کہتا ہے کہ جب عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ضعیف ہو گئے تو فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رخصت کو مان لیا ہوتا۔ (۷۴)

غالباً اسی مذکورہ واقعے کی تفصیلات اسی روایت میں زیادہ ہیں، مفہوم دونوں روایات کا بالکل واضح

۶۰۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے ابتدائی دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں اکثر بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ کو زمین پر لگا دیتا، اور اکثر بھوک ہی کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک روز میں اس راستے پر بیٹھ گیا، جہاں سے لوگ نکلا کرتے تھے۔ اتنے میں وہاں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گزرے۔ میں نے ان سے قرآن کریم کی ایک آیت کا مطلب پوچھا، اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ میری حالت کو دیکھ کر مجھے کھانا کھلانے کے لئے ساتھ لے جائیں، مگر وہ چلے گئے، اور انہوں نے وہ نہیں کیا جو میں چاہتا تھا۔ (یعنی مجھے کھانا کھلانے کے لئے ساتھ نہیں لے گئے)

پھر میرے پاس سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گزرے، میں نے ان سے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کا مطلب پوچھا، اس سے بھی میری غرض یہ تھی کہ وہ میری حالت کو دیکھ کر مجھے کھانا کھلانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں، مگر وہ بھی چلے گئے، انہوں نے بھی میری غرض کو نہیں سمجھا۔

پھر میرے پاس سے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے، پس آپ ﷺ مسکرائے اور جو کچھ میرے جی میں تھا اور جو چہرے سے ظاہر تھا آپ فوراً پہچان گئے، اور فرمایا اے ابا ہر! یعنی اے ابو ہریرہ میں نے عرض کیا، حاضر ہوں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ آؤ، آپ چل دیئے اور میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ آپ گھر میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ ایک پیالہ دودھ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ دودھ کہاں سے آیا ہے۔ گھر والوں نے کہا کہ یہ فلاں نے آپ کے لئے ہدیہ بھیجا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابا ہر! میں نے عرض کیا، میں حاضر ہوں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ۔ اہلِ صفہ کو بلا لاؤ۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ صفہ اسلام کے مہمان تھے، نہ ان کا کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ گھر اور نہ ان کے پاس مال تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے کوئی صدقہ آتا تو آپ پورا اصحاب صفہ کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ تناول نہ فرماتے، اور اگر آپ ﷺ کے پاس ہدیہ بھیجا جاتا تو آپ خود بھی اس میں سے تناول فرماتے اور اصحاب صفہ کو بھی اس میں شریک فرماتے۔ پس اس وقت مجھے یہ گراں گزرا (کہ میں اصحاب صفہ کو بلا لاؤں) اور اپنے دل میں کہا کہ اس دودھ کے ایک پیالے سے اصحاب صفہ کو کیا ملے گا۔ اس پر سب سے زیادہ حق تو میرا تھا کہ اس کو پی کر کچھ قوت و توانائی حاصل کرتا، اور یہ کہ جب اصحاب صفہ آ جائیں گے تو مجھے ہی اس کی تقسیم کا حکم ملے گا اور تقسیم کے بعد اس دودھ سے میرے لئے شاید کچھ نہ بچے۔ لیکن میرے لئے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا۔

میں اصحاب صفہ کے پاس گیا اور ان کو بلا کر لے آیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابا ہر! میں نے عرض کیا، میں حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا یہ لو اور ان کو دو۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے پیالہ لے کر ایک آدمی کو دیا، جب وہ پی کر سیر ہو گیا تو اس نے پیالہ مجھے لوٹا دیا۔ پھر میں نے وہ پیالہ دوسرے آدمی کو دے دیا۔ جب وہ بھی پی کر سیر ہو گیا تو اس نے پیالہ مجھے لوٹا دیا۔ اس طرح جب سب پی چکے تو آخر میں، میں نے پیالہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوٹا دیا۔ آپ ﷺ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: اے ابا ہر! میں نے عرض کیا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں، میں نے عرض کیا آپ ﷺ نے سچ فرمایا یا رسول اللہ اور پھر آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور پیتا شروع کر دو۔

پھر میں نے بیٹھ کر پیتا شروع کیا۔ آپ ﷺ بار بار فرماتے پیو اور پیو۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، اب بالکل گنجائش نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا مجھے دو۔ پھر میں نے پیالہ آپ کو دے دیا تو آپ ﷺ نے اللہ کی حمد کی اور بسم اللہ پڑھ کر بچا ہوا دودھ پی لیا۔ (۷۵)

فقر و فاقے کی یہ کیفیت تنہا حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی نہ تھی، خود روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ اس وقت کے بہت سے صحابہ اور اصحاب صفہ میں سے ہر ایک کی یہی کیفیت تھی، پھر یہی نہیں، کاشانۂ نبوت کی بھی یہی حالت تھی، اکثر یہ ہوتا کہ صبح کے اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کرتے کہ کھانے میں کچھ ہے، اور جب نفی میں جواب ملتا تو کہتے کہ میں نے روزہ رکھ لیا ہے۔ (۷۶)

دین اسی طرح پھیلا ہے، اور یہ روایت اب تک برقرار رہی ہے، ظاہری دنیا کی چکا چوند سے وہ لوگ کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ آئندہ بھی یہ روایت اسی طرح آگے بڑھ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

۶۱۔ اسی طرح ایک دفعہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں سخت بھوکا ہوں۔ آپ ﷺ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کھانے کی کوئی چیز ہو تو بھیج دو۔ جواب ملا کہ پانی کے سوا کچھ نہیں۔ پھر آپ نے دوسرے گھر پتہ کرایا تو وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ اسی طرح تمام ازواج کے ہاں سے پتہ کرایا اور ہر جگہ پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

۶۲۔ ایسے ہی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا، آپ ﷺ بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔ (۷۷)

یہ مدینہ منورہ کے زمانے کا واقعہ ہے، اور اس وقت آپ ﷺ امیر ریاست بھی ہیں۔ ان حالات میں آپ کا رہن سہن یہ ہے، یہ خود اختیاری فقر ہماری امارت پسندی کے سامنے ایک نئی دنیا روشن کرتا ہے۔

۶۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تمہارے سامنے ایک شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے۔ چناں چہ ایک انصاری صحابی آئے، جن کی ڈاڑھی سے تازہ وضو کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ بائیں ہاتھ میں اپنے نعلین لئے ہوئے تھے، پھر جب دوسرا روز ہوا تو آپ ﷺ نے پھر یہی فرمایا، اور پھر یہی صاحب سامنے آئے، تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا اور یہی صاحب اپنی مذکورہ حالت میں داخل ہوئے۔

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اٹھ گئے تو حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اس شخص کے پیچھے چلے اور ان سے کہا کہ میں نے کسی جھگڑے میں قسم کھالی ہے کہ میں تین روز تک اپنے گھر نہ جاؤں گا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو تین روز مجھے اپنے یہاں رہنے کی جگہ دے دیں، انہوں نے منظور فرمالیا۔ عبداللہ بن عمروؓ نے یہ تین راتیں ان کے ساتھ گزاریں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں دیکھا کہ رات کو تہجد کے لئے نہیں اٹھتے، البتہ جب سونے کے لئے بستر پر جاتے تو کچھ اللہ کا ذکر کرتے تھے، پھر صبح کی نماز کے لئے اُٹھ جاتے تھے، البتہ اس پورے عرصے میں میں نے ان کی زبان سے کلمۂ خیر کے سوا کوئی کلمہ نہیں سنا، جب تین راتیں گزر گئیں اور قریب تھا کہ میرا دل ان کے اس عمل کو حقیر تصور کرنے لگے تو میں نے ان پر اپنا راز کھول دیا کہ ہمارے گھر میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، البتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین روز تک یہ سنتا رہا کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے اور اس کے بعد تینوں دن آپ ہی آئے، اس لئے میں نے چاہا کہ میں آپ کے ساتھ رہ کر دیکھوں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے جس کے سبب یہ فضیلت آپ کو حاصل ہوئی، مگر عجیب بات ہے کہ میں نے آپ کو کوئی بڑا عمل کرتے نہیں دیکھا تو وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو اس درجے پر پہنچایا۔ انہوں نے کہا، میرے پاس تو اس کے علاوہ کوئی عمل نہیں جو آپ نے دیکھا ہے۔ میں یہ سن کر واپس آنے لگا تو مجھے بلا کر کہا:

ما هو الا ما رأيت غير انى لا اجد فى نفسى لاحد من المسلمين غشا، ولا احسد احدا على خير اعطاه الله اياه، فقال عبد الله هذه التى بلغت بك وهى التى لا نطيق (۷۸)

ہاں ایک بات اور ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ اور برائی نہیں پاتا، اور کسی ایسے شخص پر حسد نہیں کرتا جس کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اچھی چیز عطا فرمائی ہو۔ عبد

اللہ بن عمروؓ نے کہا کہ بس یہی وہ صفت ہے جس نے آپ کو یہ بلند مقام عطا کیا ہے۔

دلوں کا صاف رکھنا ایمان کا حصہ ہے، اور اسی روایت کی رو سے بہت بڑی عبادت بھی، جس کے نتیجے میں انسان جنت کا حق دار بن جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اتنے بڑے عمل کو ہم معمولی سی عبادت کی اہمیت بھی دینے کو تیار نہیں۔

۶۴۔ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ایک صحابی رسول ہیں، وہ ایک وفد کے ہم راہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور کئی روز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی پر رونق و بابرکت مجلس سے فیض یاب ہوتے رہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم رحيما رقيقا (۷۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحیم المزاج اور نرم دل تھے۔

رحم دلی، نرمی اور رقتِ قلب اچھے انسان کی بنیادی صفات میں سے ہیں، ہر طرح کی اچھائی اور بھلائی اس سے وابستہ ہے، خود ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

من يحرم الرفق يحرم الخير (۸۰)

جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔

اور دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی اور رفق کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نرمی اور نرم دلی پر بیش بہا انعامات فرماتے ہیں۔ فرمایا:

ان الله رفيق يحب الرفق ويعطي على الرفق مالا يعطي على العنف وما لا يعطي على ماسواه (۸۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر انسان کو وہ کچھ عطا کرتا ہے جو وہ نہ تو سختی پر عطا کرتا ہے نہ اس کے سوا کسی اور چیز پر۔

۶۵۔ ایک دفعہ تین صحابہ کرامؓ کاشانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے اور آپ کی عبادت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں، پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں پوری رات شب بیداری میں گزارا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے سے رہوں گا، تیسرے نے کہا میں کبھی عورت کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اس گفت گو کی اطلاع جب آں حضرت ﷺ کو ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ تم لوگوں نے یہ کیا بات طے کی ہے؟

اما والله انی لاخشاكم لله واتقاكم له، لكني اصوم وافطر واصلي وارقد

واتزوج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۸۲)

خدا کی قسم میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہوں، اور اس کا اطاعت گزار بھی ہوں، لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور رات میں سوتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں، لہٰذا سن لو کہ نکاح میری سنت ہے، اور جو شخص میرے اس طریقے سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۶۔ نبی رحمت علیہ الصلاۃ والسلام نے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال کی تلقین کی ہے اور افراط و تفریط سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اسلام کا مطلوب ایسا شخص ہے جو ہر معاملے میں میانہ روی کو پیش نظر رکھے اور اس کا طرز عمل افراط و تفریط دونوں سے یک سر پاک ہو، درحقیقت تعلیمات اسلام اعتدال کا دوسرا نام ہے۔

کسی غزوے کے موقع پر ایک صحابی رسول ﷺ کا گذر ایک غار پر ہوا، جس کے قریب پانی بھی موجود تھا اور اس کے پاس سبزہ بھی اگا ہوا تھا، انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے ایک ایسا غار مل گیا ہے، جس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں، میری خواہش ہے کہ میں وہاں گوشہ نشین ہو کر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا، اور فرمایا:

انی لم ابعث بالیھودیۃ ولا بالنصرانیۃ، ولکنی بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ (۸۳)

میں یہودیت و نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا، میں تو آسان اور سہل دین ابراہیمی لے کر آیا ہوں۔

یعنی اسلام یہودیت و نصرانیت سے الگ ایسا دین ہے، جس میں کسی انسانی جذبے، رویے اور ضرورت کو ختم کرنے کی تلقین نہیں کی گئی، انسان کو صرف اس قدر پابند رکھا گیا ہے کہ وہ ان جذبوں اور رویوں کی تہذیب کرے اور انہیں اعتدال میں رکھے۔

۶۷۔ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا اور ان کی دل آزاری کی، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خاموش رہے، اس شخص نے پھر ایسی ہی بات کہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پھر بھی خاموش رہے، تیسری مرتبہ جب پھر اس شخص نے انہیں تکلیف پہنچائی تو انہوں نے اس کا جواب دے دیا، یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! کیا آپ ناراض ہوگئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، بل کہ جب وہ شخص تمہیں برا بھلا کہہ رہا تھا تو آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا تھا، جو اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا، مگر جب تم نے اس کا جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ چلا گیا اور شیطان آکر بیٹھ گیا، اور میں ایسی جگہ پر نہیں بیٹھ سکتا جہاں شیطان ہو۔ (۸۴)

جذبات میں آکر کسی کی غلط بات کا جواب دینا بھی اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، کیوں کہ اس سے غلط بات کہنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تعمیری کام کرنے والوں کی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔

۶۸۔ بنی مالک بن کنانہ کے ایک شخص سے امام احمدؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سوق ذی المجاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ ﷺ یہ فرمارہے تھے:

یا ایھا الناس، قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا

اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہ دو، کام یاب ہوجاؤ گے۔

راوی کہتے ہیں کہ ابوجہل بھی آپ کے ساتھ ساتھ تھا، وہ آپ ﷺ پر مٹی پھینکتا جاتا تھا، اور یہ کہتا جاتا تھا:

لوگو! یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ نہ کردے، اس کی تو خواہش (اور کوشش) یہ ہے کہ تم اپنے معبودوں کو چھوڑ دو، اور لذت وعزیٰ (کی پرستش) کو ترک کردو۔

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جانب توجہ ہی نہ فرماتے تھے۔ (۸۵)

یہ واقعہ سیرت طیبہ کا ایک اہم واقعہ ہے، مگر یہاں ہماری دل چسپی کا باعث راوی کا یہ جملہ ہے،

وما یلتفت الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (ابوجہل) کی جانب توجہ ہی نہ فرماتے تھے۔

اس واقعے سے پہلا مفہوم یہی اخذ ہوتا ہے کہ انسان جب کسی بڑے کام کو اپنا اولین مقصد قرار دے لیتا ہے تو اس کے سامنے معمولی اور سطحی نوعیت کی باتیں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں، اس کا مزاج از خود انہیں نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے، جو جب کسی بڑے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو راستے کے معمولی کنکر اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، اس کی تو نظر سنگ میل سے کہیں آگے منزل پر ہوتی ہے۔

اس واقعے میں اس طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ بڑے کام کے کرنے والوں کو رکاوٹیں ضرور پیش آتی ہیں، اور وہ رکاوٹیں ان کی توجہ تقسیم کرسکتی ہیں، لیکن صحیح معنیٰ میں جس کی اپنے مقصد سے وابستگی ہوتی ہے، اور اس کی نظر اپنے رب پر ہوتی ہے، اس کی توجہ تقسیم نہیں ہوسکتی۔

اس واقعے میں یہ درس بھی پوشیدہ ہے کہ ان حالات میں جب انسان کی توجہ اپنے اعلیٰ مقاصد سے ہٹنے لگے تو امکانی حد تک کوشش یہ ہونی چاہئے کہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے تمام واقعات اور حادثات کو انسان نظر انداز کرتے ہوئے آگے کی جانب اور اپنی منزل کی سمت میں اپنے سفر جاری رکھے، اور رکاوٹ بننے والی قوتوں سے اعراض اور کنارہ کشی کا رویہ اختیار کرے۔

۲۹۔ غزوۂ احد اپنی شدت اور سختی کی بنا پر ایک تاریخی غزوہ ہے۔ یہ غزوہ کئی ایک اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے، خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر کہ یہ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ اسی غزوے کا مشہور واقعہ ہے کہ جب یہ غزوہ اپنے جوبن پر تھا اور معرکۂ حق و باطل بپا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کہ کون اس تلوار کا حق ادا کرے گا؟ چند صحابۂ کرام آپ کی طرف بڑھے، مگر آپ ﷺ نے انہیں تلوار نہیں دی، پھر حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ سامنے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس تلوار کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس سے دشمن کو مارو، یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کر دو، ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ قبول کرتا ہوں، چناں چہ آپ ﷺ نے انہیں تلوار عنایت کر دی، حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے تلوار تھامی اور چل پڑے، انہوں نے اپنے سر پر سرخ رنگ کی پگڑی باندھی اور موت سے نڈر ہو کر جنگ میں کود پڑے، وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑتے اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے رہے۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں:

> میں نے ایک شخص کو دیکھا وہ بری طرح لوگوں کو جنگ پر ابھار رہا تھا، میں اس کی طرف لپکا، جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو میں نے اس کی آواز سنی کہ ''ہائے تباہی'' تب مجھے علم ہوا کہ یہ تو کوئی عورت ہے۔ اس وقت (میرا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور) میں نے رسول اللہ ﷺ کی تلوار کو کسی عورت کے خون سے پاک رکھا۔ (۸۶)

وہ عورت ہند بنت عقبہ تھی اور اس وقت ایک اور صحابی رسول کے بہ قول ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی تلوار اس کے سر پر اٹھ چکی تھی، مگر پھر انہوں نے تلوار ہٹائی، اگر غور کیا جائے تو وہ وقت بڑا ہی نازک تھا، ایسے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی اس ہدایت اور حکم کا ذہن میں رہنا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل مت کرو، بہ جائے خود ایک اہم واقعہ ہے۔ پھر بڑھی ہوئی تلوار کو نیام میں واپس کر لینا اور ایک ایسے موقع پر جب تلوار خون چاٹ چکی ہو، سامنے مذہب اور جان کے دشمنوں کا لشکر ہو، جو تہیہ ہی یہ کر کے آیا ہو کہ آج مسلمانوں کا قصہ پاک کر دینا ہے، عام حالات میں سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، اس بات کی اہمیت اور حقیقت محض

محسوس ہی کی جاسکتی ہے۔

اس قصے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کس قدر کامیاب تھی اور اصحاب رسول ﷺ کو اپنے جذبات پر کس قدر قابو تھا، ان کے اعمال و افعال اسلامی تعلیمات کے ماتحت تھے اور ان کے شعور میں اسلام اور اسلامی احکام پوری طرح راسخ ہو چکے تھے اور ذاتی جذبات کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی تھی، وہ انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی نہایت صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ فیصلہ کرنے کی پوری قدرت رکھتے تھے۔ وہ غصے اور انتقام کے مواقع پر بھی اسلامی ہدایات کو اولین ترجیح دینے پر پوری طرح قادر تھے، یہی ان کے ایمان کی سب سے بڑی خوبی تھی اور یہی کردار کو پرکھنے کی سب سے اہم کسوٹی ہے۔

اسلام کسی کے جذبات، احساسات، خواہشات اور ذاتی فہم و ارادے کا نام نہیں، محض اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام اور ارشادات کا نام ہے، اگر کوئی ان ارشادات و احکام کے ذیل میں آتا ہے تو وہ شریعت کی نگاہ میں درست ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

جو فعل اور عمل ذاتی احساسات اور جذبات کے ماتحت صادر ہوا ہو، وہ چاہے مسلمان سے صادر ہو یا غیر مسلم سے، اس کا کرنے والا خواہ دین دار ہو یا دنیا دار، اس کی شریعت میں نہ کوئی اصل ہے، نہ کوئی حقیقت، وہ انسان کے دیگر افعال کی مانند ایک فعل ہے۔ اگر وہ فی نفسہ مباح ہوگا تو اس کے مباح اور جائز ہونے کا حکم ہوگا اگر وہ فی ذاتہ غلط ہوگا تو اس کے غلط ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ الاحزاب:۲۱

۲۔ بخاری۔ الصحیح۔ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۵۳ء: ج ۱، ص ۶، رقم ۳

۳۔ انجیل یوحنا: ۱۹۔۱۵

۴۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء: ج ۱، ص ۲۰۹

☆ ابن کثیر۔ السیرۃ النبویہ۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت: ج ۱، ص ۲۵۵

۵۔ الروض الانف۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ السہیلی۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء: ج ۱، ص ۱۵۵، ۱۵۷

☆ سیرت ابن کثیر: ج ۱، ص ۲۶۱

۶۔ ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ۔ دار صادر، بیروت، ۱۴۷۷ھ: ج ۳، ص ۴۱

۷۔ المائدہ:۸

۸۔ ابن کثیر: ج ۱، ص ۲۷۰

☆ زرقانی علی مواہب اللدنیہ۔ ابوعبداللہ محمد بن عبدالباقی۔ دارالمعرفہ، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۱، ص ۲۰۳

۹۔ العلق: ۱۔۵

۱۰۔ ترمذی۔ السنن: مناقب عمر بن الخطاب

☆ ابن حبان۔ الصحیح۔ موسسۃ الرسالہ، بیروت: ج ۱۰، ص ۱۷

۱۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۱۳۲۲، رقم ۳۴۱۶

۱۲۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۴، ۵

۱۳۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۵

☆ ابن کثیر: ج ۱، ص ۵۰۴

۱۳/الف۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۶

۱۳/ب۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۶

۱۴۔ تفصیل کے لئے: بخاری: ج ۲، ۱۴۶۔ مسلم: کتاب الجهاد والسیر باب مالقی النبی من اذی المشرکین والمنافقین

۱۵۔ احمد بن محمد بن حنبل۔ المسند۔ دارالحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۴، ص ۵۴۸، رقم ۱۵۵۹۴

۱۶۔ بخاری: ج ۲، ص ۲۲۵

☆ نسائی۔ السنن: کتاب البیعة، باب البیعة علی الجهاد

۱۷۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۸۷

☆ زرقانی: ج ۱، ص ۳۱۶

۱۸۔ زرقانی: ج ۱، ۳۱۷

☆ ابن الحجر العسقلانی۔ فتح الباری۔ قدیم کتب خانہ کراچی: ج ۷، ص ۲۸۰

۱۹۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۸۹

۲۰۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۱۹

۲۱۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۲۱

۲۲۔ ابن کثیر: ج ۲، ص ۲۳۴

☆ ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۲۲

۲۳۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۷۰

۲۴۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۷۳

☆ فتح الباری: ج ۷، ص ۳۴۵

۲۵۔ بخاری: ج ۲، ص ۲۱۲

۲۶۔ مسلم: ۳، ص ۱۵۹، رقم ۱۷۸۷

۲۷۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۷۰، ۷۱

☆ سیرت ابن کثیر: ج ۲، ص ۴۸۶

۲۸۔ ابن ہشام: ۳، ص ۷۱

☆ سیرت ابن کثیر: ج ۲، ص ۴۸۷۔۴۸۸

۲۹۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۴۶

۳۰۔ بخاری: ج ۲، ص ۸۰

☆ مسند احمد: ج ۵، ص ۴۳۲

۳۱۔ سیرت ابن کثیر: ج ۳، ص ۳۱۶

☆ عیون الاثر۔ h ابن سید الناس، مکتبہ دار التراث، مدینہ منورہ ۱۹۹۲ء: ج ۲، ص ۱۶۴

☆ شامی۔ سبل الہدیٰ والرشاد۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۵، ص ۴۵

۳۲۔ عیون الاثر: ج ۲، ص ۱۶۶

☆ شامی: ج ۵، ص ۴۸

☆ سیرت ابن کثیر: ج ۳، ص ۳۱۹

۳۳۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر باب غزوۃ ذی قرد

☆ مسند احمد: ج ۱، ص ۹۶

☆ ابن قیم جوزیہ۔ زاد المعاد۔ مکتبہ المنار الاسلامیہ، کویت، ۱۹۸۷: ج ۳، ص ۲۹۱

۳۴۔ فتح الباری: ص ۱۸۔۱۹

۳۵۔ زاد المعاد: ج ۳، ص ۲۹۱

☆ شامی: ج ۵، ص ۴۷

۳۶۔ زرقانی: ج ۲، ص ۱۹۴ و ۲۰۸

۳۷۔ بخاری: ج ۲، ص ۸۲۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر باب صلح الحدیبیہ

☆ مسند احمد: ج ۵، ص ۴۳۳

۳۸۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۲۹

۳۹۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۲۴

☆ ابن کثیر: ج ۳، ص ۳۲۲

۴۰۔ فتح الباری: ۲۴۔۲۵

۴۱۔ بخاری: ج ۲، ص ۸۲، ۸۳

☆ مسند احمد: ج ۵، ص ۴۳۴

۴۲۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۲۹

☆ سیرت ابن کثیر: ج ۳، ص ۴۳۰

۴۳۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۳۹

۴۴۔ الطبقات: ج ۲، ص ۱۱۳

۴۵۔ ابوداؤد السنن: کتاب الحج باب المحرم یؤدب غلامه

☆ ابن ماجہ۔ السنن: کتاب المناسک باب التوقی فی الاحرام

۴۶۔ زرقانی: ج ۸، ص ۱۵۸

☆ شامی: ج ۸، ص ۴۶۰

۴۷۔ سیرت ابن کثیر: ج ۴، ص ۳۵۲

☆ مقریزی۔ امتاع الاسماع: ج ۱، ص ۲۳۹

۴۸۔ ابن سعد۔ الطبقات: ج ۲، ص ۹۱

۴۹۔ ایضاً: ج ۲، ص ۱۱۲

۵۰۔ ابوداؤد: ج ۳، ص ۱۱۳، رقم ۳۰۶۷

۵۱۔ ابن ابی شیبہ۔ المصنف: ج ۷، ص ۴۱۶، رقم ۳۶۹۸۳

۵۲۔ شامی: ج ۷، ص ۴۷

۵۳۔ بخاری: ج ۲، ص ۲۱۳

☆ مسند احمد: ج ۶، ص ۲۹۵

۵۴۔ بخاری: ج ۲، ص ۱۹۶

☆ حلبی۔ انسان العیون۔، دار احیاء التراث العربی، بیروت،: ج ۳، ص ۴۵۸

☆ سیرت ابن کثیر: ج ۴، ص ۴۵۶

۵۵۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۳۲۷، رقم ۴۹۹۶

۵۶۔ ترمذی: ج ۳، ص ۴۰۱، رقم ۲۰۰۳

۵۷۔ الدار قطنی۔ السنن۔ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور،: ج ۲، ص ۳۰۷

۵۸۔ النور: ۲۲

۵۹۔ احمد: ج ۴، ص ۶۵۵، رقم ۱۶۱۴۱

۶۰۔ احمد: ج ۷، ص ۵۴۴، رقم ۲۶۶۸۴

۶۱۔ احمد: ج ۱، ص ۱۲۸، رقم ۵۹۷

۶۲۔ احمد: ج ۱، ص ۱۷۱، رقم ۸۴۰

۶۳۔ شبلی نعمانی۔ سیرت النبی۔ دارالاشاعت، کراچی: ج ۶ ص ۱۷۸

۶۴۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۴۲، رقم ۴۱۴۹

۶۵۔ سیرت النبی: ج ۲، ص ۲۰۱

۶۶۔ الہیثمی۔ مجمع الزوائد۔ دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء: ج ۸، ص ۵۹۷، رقم ۱۴۲۵۲

۶۷۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۱۷، رقم ۴۰۶۳

۶۸۔ ابوداؤد: ج ۴، ص ۱۷، رقم ۴۰۶۲

۶۹۔ زرقانی: ج ۴، ص ۲۶۵

۷۰۔ زرقانی: ج ۴، ص ۳۰۴

۷۱۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۵۰

۷۲۔ حاکم۔ المستدرک۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول ۱۹۹۰ء: ج ۳، ص ۵۰، رقم ۴۳۶۶

۷۳۔ الترمذی۔ الجامع السنن۔ دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء ترمذی: ج ۴، ص ۱۶۹، رقم ۲۳۸۹

۷۴۔ بخاری۔ کتاب الصیام، باب حق الجسم فی الصیام

۷۵۔ بخاری: ج ۴، ص ۸۶، ۸۷

۷۶۔ احمد: ج ۲، ص ۴۶

۷۷۔ سیرت النبی: ج ۲، ص ۲۱۴

۷۸۔ احمد: ج ۳، ص ۶۴۶، رقم ۱۲۲۸۶ اور رقم ۱۲۷۲۰

☆ نسائی۔ کبریٰ: ج ۶، ص ۲۱۵، رقم ۱۰۶۹۹

۷۹۔ مسلم: ج ۱، ص ۳۷۷، رقم ۶۷۴

۸۰۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۲، رقم ۲۵۹۲

۸۱۔ مسلم: ایضاً، رقم ۲۵۹۳

۸۲۔ بخاری۔ کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح

۸۳۔ احمد: ج ۶، ص ۳۵۷، رقم ۲۱۷۸۸

۸۴۔ ابوداؤد

۸۵۔ احمد: ج ۱، ص ۱۰۸

۸۶۔ سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۵۲

بہار میں سیرت نگاری کا ارتقا

ایک تاریخی جائزہ

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

Abstract

The presention of Seerah or the life of the holy Prophet Muhammad (Peace be upon him) in different patterns and with different approaches has been an important subject of interest for the Muslim scholars of the past, present, and will remain in the future. On of this aspect is praising or paying tribute to the holy Prophet Muhammad (peace be upon him) is called Meelaad, which has different interprtations, among the Muslims. This activity has been persistent throught the Islamic History, in many forms, and is prevaling till this day, and will remain till the Day of Judgement. This paper attempts to present the contributions of the Muslims of the Indian subcontinent towards Meelaad in the historical perspective, with a special reference to the Indian State of "Bihar", during the 19th and 20th centuries.

پروفیسر مارگولتھ کی ہیروز آف دی نیشنس کے سلسلے کی کتاب ''محمد ﷺ'' ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی اور بہ قول علامہ سید سلیمان ندوی: ''(اس سے) زیادہ زہریلی کوئی کتاب سیرت نبوی ﷺ پر انگریزی میں نہیں لکھی گئی۔'' تاہم وہ بھی اپنی کتاب کے مقدمے میں یہ لکھنے پر مجبور ہوا:

The Biographers of The Prophet Mohammad from a long

series it is impossible to end but in which it would be honourable to find a place. (1)

محمد (ﷺ) کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ عزت ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ کیوں ایک مخالف بھی سیرت محمدی کی اس عظمت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے؟ بہ قول لیونے کائتانی:

پیغمبر اسلام کے اصولوں نے انسان کے قلب میں ایک زبردست اثر پیدا کیا، آج ان کی آواز کو خاموش ہوئے تیرہ سو برس گزر گئے، مگر انسانی قلب میں اس کا اثر ابھی باقی ہے۔

پیغمبر اسلام کی ذات عالم گیر تھی، ان کا پیغام عالم گیر تھا، ان کا مقصد عالم گیر تھا، یہی وجہ تھی کہ زمین کے ہر خطے میں اور ہر خطے کی ہر ہر قوم میں ان کی عظمت کے نشان نمایاں ہوئے، اور ان کی تقدیس کا پرتو پڑا۔ زمانہ گزر گیا مگر آج بھی لوگ سیرت نگار بننے کے شرف کے حصول کے لئے اپنے شبوں کے گداز اور دنوں کے عیش کو تج کر تحقیق وجستجو اور تلاش وتفحص کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کی نامعلوم کتنی ہی ساعتیں اس مقدس ہستی کے ایام شب وروز کی جستجو میں وقف کر دیتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ ساعتیں جو اللہ کے محبوب کی مقدس زندگی کی تلاش میں صرف ہوتی ہیں اور قیمتی ہیں وہ لمحات جو عبدالمطلب کے جگر گوشے اور آمنہ کے لعل کی حیات طیبہ کے ہمہ جہت پہلوؤں پر غور وفکر کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اس قلم کی عزت، قرطاس کی حرمت اور احساس کی عظمت کا کیا کہنا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس سے منسوب ہو۔

بایں ہمہ جہاں ہر خطہ ارضی سے تعلق رکھنے اہلِ علم حضرات نے سیرت نگاری کی مختلف جہتوں پر خدمتِ قلم انجام دیں وہیں برصغیر کے شمال مشرقی خطے بہار نے بھی اپنا حصہ ادا کیا۔ یہاں سے تعلق رکھنے والے اہل علم وقلم نے بھی اس سعادت کے حصول میں کسی طرح مسابلت گوارا نہیں کی۔ اس خطے میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۶/ ۱۷ فیصد سے زیادہ نہیں مگر یہاں سے تعلق رکھنے والے سیرت نگاروں نے براعظم کی تاریخ سیرت نگاری میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔ بلاشبہ یہاں ایسے اہلِ قلم بھی ملیں گے جن کی کتبِ سیرت کی عزت صرف اس لئے ہوگی کہ وہ ذات رسالت مآب ﷺ سے منسوب ہے، تاہم ایسے سیرت نگاروں کی بھی کمی نہیں جو سیرت نگاری کے فن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کے اہل علم نے میلاد ناموں، معراج ناموں سے لے کر سیرت کی ضخیم کتابوں تک اور نظم ونثر ہر دو انداز

سے سیرت پر خامہ فرسائی کا فریضہ انجام دیا۔ نعت گو شعرا کی ایک بہت بڑی تعداد خطہ بہار سے تعلق رکھتی ہے۔ تاہم ہم نے اپنے مقالے میں نظم سے متعلق اسی کتاب کو جگہ دی ہے جس میں بالترتیب سیرت کو بیان کیا گیا ہو۔

براعظم کے مختلف خطوں میں میلاد پڑھنے اور تقریبات میلاد کو منعقد کرنے کا عام رواج رہا ہے، عام طور پر قصہ گو واعظ اس موقع پر موضوعات اور ضعیف روایات کا سہارا لے کر سیرت کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں کیا کیا روشن پہلو موجود تھے اس کی طرف ان واعظین کرام کی توجہ کم ہی مرتکز ہوتی تھی۔ سب سے پہلے شاہ سلیمان پھلواروی نے مجالسِ سیرت میں انقلابی اصلاح کی طرف اپنی توجہ منعطف فرمائی اور ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء کو ''تحریکِ سیرت'' کی بنیاد رکھی۔ اس کے لئے بڑے پیمانے پر مجالسِ سیرت کا انعقاد کیا جاتا، اور نبی کریم ﷺ کی زندگی کو با حوالہ بیان کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ شاہ سلیمان نے اپنے صاحب زادوں کو مجالسِ سیرت میں پڑھنے کے لئے احادیث و آثار کے مطابق کتبِ سیرت لکھنے کا بھی حکم دیا۔ اس تحریک کا براعظم کے دوسرے خطوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے بھی خیر مقدم کیا۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ قاضی سلیمان منصور پوری اور ان کی کتاب رحمۃ اللعالمین ﷺ کو براعظم کی تاریخِ سیرت میں کیا مقام حاصل ہے۔ رحمۃ اللعالمین پہلے پہل ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی اور بہ قول مولانا حسن مثنیٰ ندوی:

> قاضی صاحب نے سب سے پہلے یہ کتاب مرکز تحریک سیرت (پھلواری) کو بھیجی۔ قاضی صاحب کو اس مرکز سے خصوصی ربط تھا۔ (۲)

شبلی نعمانی اور ان کی ''سیرۃ النبی ﷺ'' براعظم کی تاریخِ سیرت کا سب سے اہم باب ہے لیکن یہ باب کبھی بھی منظرِ شہود پر شرمندۂ احساس نہ ہوتا اگر سیّد سلیمان اس کی تکمیل نہ کرتے۔ شبلی کے قلم نے ڈیڑھ جلدیں ہی لکھی تھیں کہ پیمانۂ حیات چھلک پڑا۔ جس کے بعد شبلی کے اس قابلِ فخر تلمیذ رشید نے استاد کے تشنۂ تکمیل کام کو پورا کیا۔ شبلی اور سیّد سلیمان کا جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ ایک استاد ہے اور دوسرا شاگرد۔ شاید استاد کی بوقلمونی کو شاگرد نہ پہنچ سکے، لیکن سیرت کے لئے جس تحقیق و جستجو اور احساسِ ذمے داری کی ضرورت تھی، اس میں شاگرد کا پلہ استاد سے بہ ہر طور بھاری ہے۔ شبلی کے کام پر اہل علم کی جانب سے تنقیدیں بھی ہوئیں۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ایک مفصل کتاب ''مولانا شبلی نعمانی بہ حیثیت سیرت نگار'' لکھ ڈالی۔ خود علامہ سلیمان ندوی نے بھی سیرت النبی ﷺ میں کئی جگہوں پر استاد کی رائے سے اختلاف کیا اور علم و دلیل کی بنیاد پر کیا۔ مخالفین پر تنقید کرنا آسان ہے لیکن دوستوں پر تنقید بہت مشکل۔ جب کہ

یہاں تو معاملہ دوستی کا نہیں استاد کی عزت کا تھا، لیکن سیرت پر تحقیق کا معاملہ اس احساس سے کہیں بلند تر ہے اور سید سلیمان اس آزمائش میں بھی کامیاب رہے۔

بہار کے اہلِ علم نے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا۔ مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری نے ''اصح السیر'' کے عنوان سے مفصل کتاب تحریر فرمائی۔ جس میں بالخصوص مغازی کے باب میں مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا۔ بہ قول ڈاکٹر محمود احمد غازی:

> مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے، جتنی مولانا دانا پوری نے کی ہے۔(۳)

اسی طرح مولانا عبد الغفور دانا پوری نے مختلف پادریوں کے اعتراضات کے جواب میں کتابیں لکھیں۔ جو سیرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔

بہار سے تعلق رکھنے والے ایک نکتہ رس عالم مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک مختصر لیکن بالکل منفرد کتاب النبی الخاتم لکھی۔ جو کتبِ سیرت میں اپنا ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔

اور ابھی حال ہی میں ڈاکٹر محمد لقمان سلفی نے ''الصادق الامین'' لکھ کر سیرت کی اہم کتابوں میں ایک اہم کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

بہار میں سیرت سے متعلق یہ چند اہم ارتقائی کڑیاں ہیں جن کے ذکر سے اس امر کا بہ خوبی ادراک ہوسکتا ہے کہ بہار کے اہلِ علم نے برِاعظم کی تاریخ سیرت میں کتنا اور کس قدر حصہ لیا ہے۔

چند اہم کتبِ سیرت اور ان کا منہجِ تصنیف

۱۔ افضل السیر

مولانا عبد الرحیم دانا پوری نے افضل السیر ملقب بہ ہشت گوہر کے عنوان سے ۸ جلدوں میں ایک ضخیم کتاب لکھی تھی، جس کی پہلی جلد نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۳۰۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بہ قول ڈاکٹر مظفر اقبال: ریاستِ بہار میں سیرت پاک ﷺ پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں جدید اصولوں کے مطابق حضور اکرم ﷺ کے سوانح حیات بیان کئے گئے ہیں اور مآخذ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ زبان و بیان میں بھی سادگی، سلاست روانی اور ہم واری ہے۔(۴)

۲۔ سیرت النبی ﷺ

علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی کی ابتدا کی لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ اپنے احباب اور تلامذہ میں تین افراد ایسے تھے جن پر اس تکمیل کا بار ڈالا جا سکتا تھا، لہٰذا تینوں کو تار دے دیا۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد تھے، جن تک تار پہنچ ہی نہ سکا۔ دوسرے مولانا حمید الدین فراہی تھے جنہیں تار اس قدر تاخیر سے ملا کہ جب سیرت کا وہ متوالا خاموش ہو چکا تھا اور تیسرے سیّد سلیمان ندوی تھے، جن کے لئے یہ اعزاز امر الٰہی میں مقدر ہو چکا تھا۔ جیسے ہی تار ملا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر استاد کے آستانہ علم پر پہنچ گئے۔ استاد نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع شاگرد کے حوالے کر دی، اور شاگرد نے بھی استاد کی اس قیمتی متاع کو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ بنا لیا۔

شبلی نے جس مؤرخانہ شعور و احتیاط اور متکلمانہ اسلوب میں سیرت سے متعلق اپنی نگارشات کو قلم بند کیا تھا۔ سیّد سلیمان نے بہ خوبی بل کہ استاد سے بڑھ کر اسے نبھایا۔ بہ قول ماہر القادری:

> اس عظیم الشان کام کو اس خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ وہ دین و اخلاق اور تاریخ و ادب کا قابل فخر کارنامہ بن گیا۔ (۵)

علامہ شبلی کے منتشر اجزائے سیرت کو حسنِ ترتیب کے ساتھ یک جا کرنا سیّد سلیمان کا علمی کارنامہ ہے۔ پہلی جلد گو بہ ظاہر مکمل تھی لیکن اس کی ترتیب ایک مستقل تالیف کی متقاضی تھی۔ پھر دو ابتدائی جلدوں میں سیّد صاحب نے اپنے محتاط قلم سے بے شمار حواشی لکھے اور بہ کثرت اضافے کئے۔ فرطِ احتیاط کی بنا پر استاد کی تحریر میں کئے گئے اضافوں کو سیّد صاحب نے بین القوسین درج کیا ہے، تاکہ استاد اور شاگرد کی تحریر باہم مخلط نہ ہو جائے۔ ایسے قوسین دوسری جلد میں بہت زیادہ ہیں، لیکن ان قوسین میں درج عبارت اس قدر برمحل، مربوط اور مسلسل ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کہاں استاد کے قلم نے تسلسل توڑا ہے اور کہاں شاگرد نے سلسلۂ کلام کو رواں کیا ہے۔ ان قوسین کا اضافہ سیّد سلیمان کی علمی اور تصنیفی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت ہے۔

ان دونوں عالی مرتبت استاد و شاگرد کا ایک خاص کمال یہ ہے کہ انہوں نے سیرت کا ایک نیا تصور بالکل واضح اور مکمل طور پر دیا۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ ولادت سے وفات تک پیش آمدہ واقعات ہی کا نام سیرت ہے۔ لیکن ان دونوں نے سیرت اور حیات میں فرق کیا اور محدود تصور میں وسعت پیدا کر کے ایک نئی جان ڈال دی۔ انہوں نے واضح کیا کہ سیرت صرف شخصی واقعات کا نام نہیں۔ ایک

شخص کی زندگی سے اس کی تعلیمات اور افکار ونظریات کو کس طرح جدا کیا جاسکتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ رسول کی زندگی بیان کی جائے مگر رسالت کا تذکرہ نہ ہو۔ ان دونوں کے پیشِ نظر صرف سیرت نہیں بل کہ سیرت نبوی ﷺ کا دائرۃ المعارف لکھنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے امتیازی محاسن کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اور اس کی مثالیں سیرت نبوی کے واقعات سے پیش کی ہیں۔ اس طرح نبوی پیغام کی تاثیر علم وعمل کی قوت سے مدلل ہوجاتی ہے۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> مولانا سیّد سلیمان ندوی کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صَرف نظر نہیں کیا جاسکتا سیرت النبی کی چار ضخیم جلدیں سیرت نبوی اور علم کلام کا ایک قیمتی کتب خانہ ہے۔(۶)

معجزات نبوی ﷺ پر نہ صرف عقل ونقل کی روشنی میں بل کہ سائنٹفک اصولوں کے مطابق بڑی بھرپور مباحث قلم بند کئے ہیں جو بہ قول مولانا حسن مثنیٰ ندوی:

> معجزے کی حقیقت اور مقام پر عقلی حیثیت سے ایسی پُر مغز بحث کی ہے کہ اردو تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ایک جگہ اتنا بڑا اور ایسا ذخیرہ نہیں ملے گا۔ پھر تمام صحیح معجزات کو ایک ایک کرکے اس طرح سمیٹا ہے کہ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز کردیا۔ پھر ان سب پر مدلل عقلی اور سائنٹفک بحثیں کی ہیں۔(۷)

سیّد صاحب نے استاد کے منتشر ذخیرۂ سیرت کو نہ صرف حسنِ ترتیب کی رعنائی بخشی بل کہ استاد کے نامکمل بیانات کی تکمیل کی، اور استاد کے سہو قلم کی اصلاح بھی کی۔ ایک اہم بات یہ کہ شبلی باوجود اپنے کلامی انداز کے کہیں کہیں مغرب کی مرعوبیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں، جب کہ سیّد سلیمان کے یہاں ایسا تأثر نہیں ملتا۔

جس طرح قرآن کریم کے محاسن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور ہر دور میں فکر و فہم کی نئی جہتوں سے روشناس کراتے ہیں بالکل اسی طرح سیرت کا گوشہ بھی کبھی تکمیل پذیر نہیں ہوتا۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک نہ معلوم کتنی سعید روحیں ہیں جنہوں نے سیرت نبوی پر اپنے کلکِ گوہر بار کو جنبش دینے کا فریضہ انجام دیا، مگر سیرت کے تمام گوشوں کی تکمیل آج تک نہ ہوسکی۔ آج بھی پیغام محمدی ﷺ کے نئے نئے زاویے دریافت ہوتے ہیں نہ اس راہ میں کسی کی کاوش حتمی ہوسکی ہے اور نہ ہی کسی کی تحقیق حرفِ آخر۔

علامہ شبلی نعمانی سیّدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو ازواجِ مطہرات میں شامل فرماتے تھے۔ جب کہ عام طور پر مورخینِ سیرت نے ان کا شمار ملکِ یمین میں کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق:

(مقوقس نے) دولڑکیاں جو بھیجی تھیں ان میں سے ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں، دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسان کی ملک میں آئیں۔ اس واقعے کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہئے، کہ یہ دونوں عورتیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں اس لئے آں حضرت ﷺ نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ ﷺ کی حرم میں آئیں۔ (۸)

علامہ شبلی، مقوقس کے خط کی روشنی میں لکھتے ہیں:

ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی۔ اربابِ سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے یعنی کہ ''مصریوں میں بڑی عزت ہے'' یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کئے جاسکتے۔ (۹)

جب کہ علامہ سید سلیمان ندوی استادِ گرامی کے اس خیال سے متفق نہ تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ازواجِ مطہرات کے ذکر میں سیّدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن استاد کی رائے سے کھل کر مخالفت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ اس مسئلے پر ''سیرت النبی ﷺ'' میں ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک دل چسپ تسامح کا ذکر بھی مناسب ہے۔ نبی کریم ﷺ کے صاحب زادے ابراہیم علیہ السلام کی رضاعی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ امّ سیف اور امّ بردہ ایک ہی ہیں۔ یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں، لیکن ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے اور وہ ابوسیف کی کنیت کے ساتھ مشہور نہیں، امّ سیف حوالی مدینہ میں رہتی تھیں۔ (۱۰)

قاضی عیاض رحمہ اللہ کا یہ خیال درست نہیں کہ امّ سیف اور امّ بردہ ایک ہی شخصیت ہیں۔ حافظ ابنِ حجر العسقلانی رحمہ اللہ کی الاصابة فی تمیز الصحابة سے حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ امّ بردہ رضی اللہ عنہا کے حالات میں حافظ نے ابوموسیٰ کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے:

المشهور انّ التی أرضعتهٗ ام سیف و لعلهما جمیعا ارضعتاهٗ (۱۱)

مشہور یہ ہے کہ ام سیف نے حضرت ابراہیم کی رضاعت کی تھی، شاید ان دونوں ہی نے رضاعت کی ہو۔

بایں ہمہ ''سیرت النبی ﷺ'' جیسی بلند پایہ علمی تصنیف ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔ جس میں اس کی خصوصیات ومحاسن پر بھی روشنی ڈالی جائے اور تبصرہ وتنقید کا فریضہ بھی انجام دیا جائے، ظاہر ہے

کہ یہ مقالہ اس طوالت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ تاہم یہاں اس علمی تصنیف کی بعض خصوصیات کا ترتیب وار ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ اس کا اسلوب بیان خواہ وہ شبلی نعمانی کا تحریر کردہ ہو یا سید سلیمان کا نہایت علمی اور اعلیٰ ہے۔

۲۔ متکلمانہ اسلوب جس میں جذبات اور عقیدت کو عقلیت کے توازن کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔

۳۔ روایات پر محققانہ اور ناقدانہ بحث کی گئی ہے ضروری نہیں کہ ان کی ہر تحقیق سے اتفاق کیا جائے لیکن بحث قابلِ قدر ہے۔

۴۔ مستشرقین کے اعتراضات سے تعرض کیا گیا ہے اور سنجیدگی اور متانت کے ساتھ جواب دینے کی سعی کی گئی ہے۔

۵۔ قدیم علم کلام کو سہل انداز میں جدید علم کلام کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

۶۔ نبی کریم ﷺ کے معجزات پر بالخصوص عقلی ونقلی بحثیں کی ہیں۔

۷۔ سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں فلسفۂ اخلاق کی قدروں کو متعین کیا گیا ہے۔

۸۔ اسلامی عبادات کا فلسفہ اور اس پر عقلی وعلمی بحثیں کی ہیں۔

۳۔ اصح السیر

اصح السیر کا شمار نہ صرف اس کے فاضل مصنفِ گرامی مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی اہم ترین تصنیف میں ہوتا ہے بل کہ سیرت کی بھی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اصح السیر ۱۹۳۲ء میں منظرِ شہود پر آئی۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ سیرت کے باب میں مغازی کی بحث انتہائی دقیق ودشوار ہے اور بہ قول ڈاکٹر محمود احمد غازی:

> اردو میں سیرت پر عام طور پر جتنی کتابیں ہیں ان کے مقابلے میں مغازی پر بہت اچھی بحث اس کتاب میں ہے۔ مغازی پر اتنی جامع بحث اردو میں بہت کم کتابوں میں ملتی ہے، جتنی مولانا دانا پوری نے کی ہے۔ (۱۲)

مصنف اس کتاب کو ۲ جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے، تاہم وہ صرف ایک ہی جلد لکھ سکے لیکن وہ ایک جلد جو ہم تک پہنچی ہے اپنے تحقیق واستناد کے اعتبار سے انتہائی مفید اور لائقِ قدر ہے۔ مصنف کے پیشِ نظر مستشرقین کے اعتراضات تھے، اس حوالے سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شبلی کے یہاں جو مرعوبیت ہے مولانا کی فکر اس سے پاک ہے۔

کتاب کے آغاز میں مصنف نے ۴۳ صفحات پر محیط فاضلانہ مقدمہ سپردِ تحریر کیا ہے۔ تدوینِ مغازی کے سلسلے میں لائقِ تکریم مصنف نے جو علمی تحقیق پیش کی ہے اس کا خود مصنف کو بھی احساس تھا۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

> اتنی کثیر تصنیفات کے باوجود مغازی کی ترتیب اور اس کی تکمیل جس قدر مشکل ہے اس سے اہلِ نظر واقف ہیں۔ جو ترتیب مغازی کی میں نے اس کتاب میں رکھی ہے غالباً وہ اصح ترین ترتیب ہے اور اہم مواضع اختلاف کے موقع پر میں نے اس کے وجوہ دلائل کی طرف اشارات بھی کر دیئے ہیں۔ گو طوالت کے خوف سے اکثر تفصیلی مباحث سے احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اہلِ علم اس کتاب میں کتاب المغازی کو جامع، مکمل، اور بہترین ترتیب پر پائیں گے۔ (۱۳)

اسی طرح فقہیات سیرت پر بھی انہوں نے بہت مفید مواد جمع کیا ہے۔ مختلف واقعاتِ سیرت سے جو احکام شرعی مستنبط ہوتے ہیں مصنف نے علم و تحقیق کی روشنی میں اس پر اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> جن ضروری فقہی مسائل کا سیرت کے کسی خاص محل سے خاص تعلق تھا ان کو وہاں بتا دیا ہے اور بعض معرکۃ الآرا فقہی مسائل پر ایسی جامع، مکمل اور مبسوط بحث لکھ دی گئی ہے کہ اہلِ انصاف کو ان شاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ خاص میں اشتباہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مثلاً اراضی حرم کا حکم فتح مکہ میں، نکاح محرم کی بحث عمرۃ القضاء میں، متعے کی بحث غزوۂ خیبر اور فتح مکہ میں، قنوت نازلہ اور قنوت فجر کی بحث بئر معونہ میں، خلافت اور امامت کی بحث حجۃ الوداع کے آخر میں، پردۂ شرعی کی بحث ازواجِ مطہرات کے حالات میں۔ اسی طرح اور مباحث بھی ہیں جن کا حال فہرست مضامین سے معلوم ہوگا۔

مولانا داناپوری نے الفاظ کے درست تلفظ کے سلسلے میں بھی بڑی محنت کی ہے۔ افسوس کہ دوسری جلد کی خواہش پوری نہ ہوسکی، اس میں وہ بعض کلامی و تاریخی مباحث پر دادِ تحقیق دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مصنف کی خواہش کے مطابق تکمیل پذیر نہ ہونے کے باوجود اصح السیر کا شمار اردو کی اہم ترین کتبِ سیرت میں ہوتا ہے۔

۴۔ خطبات مدراس

سیّد سلیمان کی خطابت کا شاہ کار خطبات مدراس کتابی شکل میں محفوظ ہے۔ اس میں سیرت سے متعلقہ مباحث کو بڑی خوب صورتی سے سمیٹا گیا ہے۔ ان خطبات کا پسِ منظر یہ ہے کہ مدراس میں ایک بزرگ تھے شیخ جمال، انہوں نے ایک ادارہ بنایا تھا جس کے تحت براعظم کے مشاہیر علماء کو بلا کر سالانہ لکچرز کا انعقاد کرواتے تھے۔ اس سلسلے کا پہلا لکچر ۱۹۲۵ء کو سیرت نبوی ﷺ سے متعلق ہوا، جسے علامہ سیّد سلیمان ندوی نے دیا۔ یہ خطبات اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل یگانہ اور منفرد ثابت ہوئے۔ ادبیاتِ سیرت میں اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ کل آٹھ خطبات ہیں۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ہوسکتی ہے۔

۲۔ عالم گیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔

۳۔ سیرت محمدی ﷺ کا تاریخی پہلو۔

۴۔ سیرت محمدی ﷺ کا تکمیلی پہلو۔

۵۔ سیرت محمدی ﷺ کی جامعیت۔

۶۔ سیرت محمدی ﷺ کی عملیت یا عملی پہلو۔

۷۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کا پیغام۔

۸۔ پیغام محمدی ﷺ۔

یہ خطبات بعد ازاں کتابی شکل میں طباعت پذیر ہوئے۔ جو بہ قول ڈاکٹر محمود احمد غازی:

> بیسویں صدی کے ادب سیرت میں نہیں بل کہ پورے ادب سیرت میں ایک بڑا منفرد مقام رکھتی ہے۔(۱۵)

ان خطبات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں محض جذباتیت سے کام نہیں لیا گیا بل کہ خطابت کے ساتھ ساتھ قوت استدلال بھی ہے اور فراوانیِ علم بھی۔ عقیدت کا احساس بھی ہے لیکن تحقیق کی ذمے داری بھی۔ الفاظ کی وسعت بھی ہے لیکن معنویت کی گہرائی بھی۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> اسلام خود اپنے پیغمبر کو اپنی کتاب کا عملی مجسمہ، نمونہ اور پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔ تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے، طریقۂ نماز کے ناواقف سے کہتا ہے:
>
> صلّوا کما رایتمونی اصلی
>
> تم اس طرح خدا کی نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو

بیوی بچوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے

خیر کم خیر کم لاھلہ و انا خیر کم لاھلی

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے لئے سب سے اچھا ہو اور میں اپنی بیوی بچوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔

آخری حج کا موقعہ ہے شمعِ نبوت کے گرد ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم ہے، انسانوں کو خدا تعالیٰ کا آخری پیغام سنایا جارہا ہے۔ عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ آج توڑ رہا ہے، مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ دیکھو کہ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جارہی ہے۔ فرمایا:

آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیئے گئے، یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کرو، اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سودی لین دین اور کاروبار آج باطل کئے جاتے ہیں، اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں۔(۱۶)

سابق مصری سفیر برائے پاکستان ڈاکٹر عبد الوہاب عزام کی خواہش پر سیّد صاحب کے ان خطبات کا عربی میں الرسالۃ المحمدیۃ کے نام سے ترجمہ ہوا اور مصر میں یہ ترجمہ شائع ہوکر بے حد مقبول ہوا۔ اس عربی ترجمے پر مقدمہ نگاری کا فریضہ عالم اسلام کے نامور عالم شیخ محب الدین الخطیب نے انجام دیا۔ شیخ ناصر الدین الالبانی نے اپنی کتاب دفاع عن الحدیث النبوی میں الرسالۃ المحمدیۃ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

وھی ثمانی محاضرات فی السیرۃ النبویۃ و رسالۃ السلام کان ألقاھا فی جامعۃ مدارس الھند وھی ذات فوائد ھامۃ تدل عل غزارۃ علم المؤلف رحمہ اللہ تعالی وجزاہ خیرا (۱۷)

خطبات مدراس کا ایک عربی ترجمہ ڈاکٹر محمد ناظم ندوی کے قلم سے بھی شائع ہوا تھا۔

اور بہ قول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

ان کی کتاب ''خطبات مدراس'' سیرت کی مؤثر و مفید ترین کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔(۱۸)

۵۔ النبی الخاتم

ادبی اسلوب بیان کی حامل اور بہ قول ڈاکٹر محمود احمد غازی سب سے دل چسپ اور البیلی کتاب النبی الخاتم ﷺ ہے، اس کے لائق تکریم مصنف مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی ہیں۔ یہ نہایت مختصر سی کتاب ہے، اس میں کوئی نئی تحقیق بھی نہیں لیکن اس کے اعلیٰ ادبی معیار نے اس مختصر سی کتاب کا شمار اردو کی اہم کتبِ سیرت میں کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی فرماتے ہیں:

> اس موضوع پر سب سے دل چسپ اور البیلی کتاب جو ادبی اندازِ سیرت کا بہت عمدہ نمونہ ہے وہ براعظم کے ایک بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک کتاب ہے۔ مولانا نے النبی الخاتم کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی۔ اس میں نہ واقعات میں کوئی ترتیب ہے۔ نہ بہ ظاہر اس میں کوئی نئی تحقیق ہے۔ لیکن پڑھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتا ہے گویا لکھنے والا دل کی دنیا میں بیٹھ کر ایک عجیب انداز سے لکھ رہا ہے۔ میں اس کتاب کا ایک جملہ سنا کر بات ختم کر دیتا ہوں۔ مسجد نبوی کے فرش پر رسول اللہ کے سونے یعنی آرام فرمانے کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں کہ: ''وہ فرش خاک پر کیا سویا۔ کیا کہنے اس سونے کے! کہ خاک کو سونا کر دیا۔'' (۱۹)

اگر خداوند خدا، یسوع مسیح اور روح القدس جیسی اصطلاحات سے صرف نظر کر لیا جائے تو النبی الخاتم میں انجیلی انداز بیان کی جھلک بھی صاف نظر آئے گی۔ وہ سادہ سی بات کو بھی ایک واقعہ اور تمثیل بنا کر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی بڑے بڑے نکات محض اشاروں میں بیان کر دیتے ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں:

> قرآن نے اگر مکہ ہی کا نام بکہ بتایا تو تم کو اطمینان نہیں ہوا، لیکن جب قرآن کے مشہور دشمن مارگولیوتھ نے بھی گواہی دی کہ زبور کا یہ بکہ عرب کے مکہ کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تو منکر اب کیوں چپ ہیں، حال آں کہ جس کے باپ نے بیابان میں اپنی بانسری بجائی تھی۔ اسی کے بیٹے سلیمان علیہ السلام نے اپنے تخت شاہی پر اس کے آگے سر بھی جھکایا تھا۔ اشاروں کنایوں میں نہیں علانیہ نام لے کر اپنے دل کی اس لگن کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا: ''وہ خلو محمدیم زہ ودسی زہ رعی'' (تسبیحات سلیمان پ ۵: ۱۲) ''وہ ٹھیک محمد ہیں۔ وہ میرے محبوب ہیں، میری جان'' اور کیا اس کے لئے اس کے گھر کے لئے صرف حضرت

داود سلیمان علیہ السلام ہی تڑپے (۲۰)

النبی الخاتم اپنی پہلی طباعت سے لے کر آج تک علمی وادبی حلقوں میں مقبولِ عام ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۶۔ تذکرۂ جمیل

یہ کتاب شاہ محمد جعفر پھلواروی نے تالیف کی ہے۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی لکھتے ہیں:

اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے کے تین ابواب ہیں۔ مسلسل بیانِ سیرت، انتیس وفود کا ذکر جو بارگاہِ رسالت میں آئے اور چودہ خطبات نبوی۔ دوسرے حصے میں قرآن مجید، جنگ و جہاد، تعدد ازدواج النبی، قانون طلاق اور غلامی وغیرہ پر بہ حیثیت مسئلہ بحثیں ہیں۔ تیسرے حصے میں اسلام کا نظام الاخلاق ہے۔ ان تینوں جلدوں کی خصوصیت یہ ہے کہ

الف: بیان سیرت کو بارہ مجالس میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

ب: اس میں جا بہ جا وہ عارفانہ نکات اور سوز و درد کی کیفیات بھی ہیں جو مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کا خاص حصہ تھیں۔

ج: وہ عقلی مباحث اور نفسیاتی نکتے بھی درج ہیں جن کا سیرت نگاروں نے ذکر نہیں کیا۔

د: اندازِ بیان بہت سادہ اور رواں ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ کتاب اگرچہ متاخر ہے لیکن اس لحاظ سے اولیت اس کو حاصل ہے کہ براعظم پاک و ہند میں باغِ سیرت کا پودا لگانے والے شاہ سلیمان پھلواروی کے بیانِ سیرت اور نکات و معارف کو قلم بند کیا گیا ہے۔ (۲۱)

۷۔ پیغمبر انسانیت

شاہ محمد جعفر پھلواروی نے پیغمبر انسانیت کے نام سے نبی کریم ﷺ کی سیرت کے بعض اہم ترین پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ پیغمبرِ انسانیت پہلی بار ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس پر سنِ طباعت درج نہیں۔ تعداد صفحات ۶۲۰۔

شاہ محمد جعفر نے اپنے مخصوص انداز میں سیرت نگاری کا فریضہ انجام دیا ہے۔ سیرت کے مختلف واقعات کو بیان کر کے وہ سرسری طور پر گزر نہیں جاتے ہیں بل کہ لمحہ فکریہ کے عنوان سے اپنے حاصلِ مطالعہ کو پیش بھی کرتے ہیں۔ وہ کسی قدر مائل بہ عقلیت بھی رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ واقعات کا تجزیہ کرنے میں قیاس سے بہت کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن

کی نہ صرف یہ کہ کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی بل کہ بحث ہی لا حاصل قرار پاتی ہے۔ مثلاً غارِ حرا میں جبریل امین جب پہلے وحی لے کر آئے تو بہ قول مولف وہ صورت بشری میں نہیں آئے بل کہ یہ محض ایک روحانی کیفیت اور وجدانی احساس تھا۔ تاہم آخر میں خود ہی لکھتے ہیں:

> بہ ہر حال یہ روحانی کیفیات ہوں یا مادّی محسوسات۔ دونوں ہی ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں اور ان کا شمار ان غیوب میں ہے جن پر ایمان بالغیب ہی لایا جا سکتا ہے۔ (۲۲)

عام طور پر یہ بحث اکثر سیرت نگاروں میں چھڑتی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے ایمان کون لایا۔ فاضل مولف نے ''اوّلیت اسلام کی غیر ضروری بحث'' کے عنوان سے بہت عمدہ نکتہ پیش کیا ہے۔ نکتہ آفرینی کی یہی عادت اکثر اوقات سیرت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا باعث بھی بنتی ہے۔ جن کی طرف دوسرے سیرت نگاروں کی توجہ کم ہی گئی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

> اسلامی تاریخ میں دو ہی غار ہیں جن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک ہے غارِ حرا جہاں پہلی وحی آئی تھی اور دوسرا ہے غارِ ثور جہاں حضور اور صدیق نے تین دن گزارے تھے۔ غار حرا کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے مگر غار ثور کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ (۲۳)

لائقِ تکریم مصنف نے واقعاتِ سیرت سے عصر حاضر کے مسائل کا حل نکالنے کی سعی بھی کی ہے۔ بہ وقتِ ہجرت جناب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن اریقط کو راز دار بنایا تھا جو اس وقت مشرک تھے۔ اس واقعے کی روشنی میں لکھتے ہیں:

> زندگی کے اتنے نازک موڑ پر ایک مشرک کو راز دار بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ عام اصولِ زندگی تو یہی ہے کہ اپنے خاص معاملات میں غیر مسلموں کو شریک نہ کیا جائے، لیکن اگر کسی کے طرزِ عمل اور دوسرے قوی قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وقتِ معین تک راز دار رہے گا اور اس وقت کے بعد اگر افشا بھی ہو جائے تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو اس پر اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ (۲۴)

اسی واقعے کی روشنی میں مزید فرماتے ہیں:

> ہماری مملکت پاکستان میں یہ بحثیں کئی موقعوں پر سامنے آئی ہیں کہ غیر مسلم کو کوئی کلیدی منصب دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس معاملے میں اقتضائے احوال کے مطابق ہر ممکن احتیاط تو مقدم اصول ہے لیکن کسی کسی موقعے پر حضور ﷺ یا جناب ابوبکرؓ کے طرزِ عمل سے ہمیں روشنی مل سکتی ہے۔ (۲۵)

فاضل مولف کو شعر وسخن کا بھی عمدہ ذوق تھا، یہی وجہ ہے کہ کتاب کے مختلف مقامات پر فارسی واردو کے اشعار برمحل پیش کرتے ہیں جس سے کتاب کے ادبی محاسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ پیغمبر انسانیت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ سیرت محمدی سے مشکل ترین مقام پر صبر واستقلال کی قوت کو نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی بے محل نہیں بل کہ ضروری ہے کہ راقم کے پیش نظر پیغمبر انسانیت ﷺ کی اوّلین طباعت بھی ہے اور پانچویں طباعت (سن طباعت ۲۰۰۶ء) بھی۔ اس پانچویں طباعت میں اوّلین طباعت کے بعض مقامات کو حذف کر دیا گیا ہے گزشتہ سطور میں جبریل امین کی پہلی وحی سے متعلق پیغمبر انسانیت کی جو عبارت پیش کی گئی ہے وہ موجودہ طباعت میں شامل اشاعت نہیں ہے۔ اسی طرح کتاب کے آغاز میں مولف کے بھتیجے مولانا حسن مثنیٰ ندوی نے جو فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا تھا اس کی بھی تلخیص کر دی گئی ہے۔ نیت خواہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن اس طرح مرحومین کی تحریروں میں کتر بیونت کا فریضہ انجام دینا کسی طرح لائق ستائش نہیں۔ اختلاف کے لئے کسی صاحب علم سے کتاب پر باقاعدہ حواشی لکھوائے جاسکتے تھے۔ ناشر کی دانست میں مولف نے جن جن مقامات پر ٹھوکر کھائی ان کی نشان دہی کی جاسکتی تھی، مگر اس طرح تحریف کا ارتکاب کرنا یقینی طور پر نامناسب فعل ہے۔

۸۔ الصادق الامین

ڈاکٹر محمد لقمان سلفی نے اپنی قابل قدر تصنیف الصادق الامین کو ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء میں منصۂ شہود پر پیش کیا۔ حسن ترتیب، الفاظ وبیان کی سلاست وروانی اور تحقیقی واستنادی معیار نے اس کتاب کا شمار اہم کتب سیرت میں کر دیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے ۱۲۸ اہم جغرافیائی نقشوں کو، جن کا تعلق مختلف غزوات اور جہادی معرکوں سے تھا، اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کے پانچ مکاتیب کی عکسی اشاعت کی ہے۔

مآخذ سیرت کے حوالے سے مصنف کا نقطہ نظر یہ ہے:

> اس سلسلے میں اس بات کو جاننا از بس ضروری ہے کہ بہت سی طویل تفصیلات جو سیرت نبویہ کی قدیم ترین کتابوں میں ملتی ہیں، اگر چہ وہ حدیث صحیح کی شرطوں پر پوری نہیں اترتیں، لیکن اُن کی بنیادی باتیں صحیحین اور دیگر کتب احادیث میں صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان تفصیلات کا بیش تر حصہ مجموعی طور پر ثابت ہے، اور انہیں درخور اعتنا نہ سمجھنا اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت نبویہ کے ساتھ ظلم ہوگا۔ (۲۶)

چناں چہ ڈاکٹر سلفی نے کتاب میں مختلف مقامات پر کتبِ تاریخ سے بھی تنہا روایتیں پیش کی ہیں۔ مصنف شیخ ناصر الدین البانی سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں لہٰذا یہی وجہ ہے کہ روایات کی صحت وضعف کے سلسلے میں شیخ البانی کی رائے کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔

کتاب میں انہوں نے عرب کی تاریخ اور قبل از اسلام مذاہب کا بھی ذکر کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے متعلق گزشتہ مذاہب میں جو پیشین گوئیاں مذکور ہیں انہیں بھی ذکر کیا ہے۔ کتاب میں سوانحی واقعات کو کثرت سے نقل کیا گیا ہے۔

بہار کے خادمینِ سیرت

چند اہم کتب سیرت کے تفصیلی تذکرے کے بعد بہار کے جن اہل علم نے اپنے قلم کے ذریعے سیرت نگاری کی خدمت انجام دی اور اپنے لئے عز وشرف کی سعادتیں حاصل کیں، ان کا ذکر خیر تاریخی ترتیب کے اعتبار سے درج ذیل ہے، تاکہ بہار میں سیرت نگاری کے تاریخی ارتقا کی جھلک چشم تصور میں نمایاں ہو سکے۔ یہ ذکر گزشتہ دو صدیوں کے اہل علم تک محدود ہے یہ واقعہ بھی ہے کہ نہ صرف بہار بل کہ پورے برعظیم میں سیرت نگار بہ طور تحریک ان ہی ادوار میں نمایاں ہوئی۔

۱۔ مولانا امین اللہ نگرنہسوی (م ۱۲۳۳ھ)

مولانا امین اللہ انصاری نگرنہسوی برعظم کے مشہور عالم، مفسر، محدث، منطقی، ادیب وشاعر تھے۔ انہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے تلمذ کا فخر حاصل تھا۔ ان کی فضیلتِ علمی کا اندازہ اس امر سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس کا منصب تفویض کیا گیا۔ انہوں نے متعدد کتابیں تالیف فرمائیں اور ان کے تلامذہ کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ ۱۲۳۳ھ میں کلکتہ میں وفات پائی۔ (۱)

مولانا امین اللہ نے ۱۸۸۰ اشعار پر مشتمل نبی کریم ﷺ کی سیرت پر ''قصیدۂ عظمیٰ'' فارسی نظم میں لکھا۔ چوں کہ مولانا امین اللہ عالم ومحدث تھے، یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں معتبر روایات کا خیال رکھتے ہوئے سیرت کو بیان کیا گیا ہے۔ مشہور اہلِ حدیث عالم سیّد میاں نذیر حسین محدث دہلوی کو بہ قول ان کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری: ''یہ قصیدہ غالباً پورا از بر تھا۔'' (۲۸)

۲۔ مولانا علی سجاد نعمتی پھلواروی (م ۱۲۷۱ھ)

مولانا علی سجاد نعمتی بن نعمت اللہ پھلواروی ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ کتبِ درسیہ کی تکمیل مولانا احمدی

پھلواروی سے کی۔ صاحبِ تصنیف و تدریس تھے۔ شعر و سخن سے بھی تعلق تھا، نعمتی تخلص فرماتے تھے۔ ۱۸ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ کو پھلواری میں وفات پائی (۲۹)۔ سیرت سے متعلق آپ کی ایک کتاب ''فضائل رسول اللہ ﷺ'' کا ذکر ملتا ہے۔

۳۔ مولانا حکیم حسن علی حسن سہسرامی (م ۱۲۹۰ھ)

مولانا حکیم حسن علی حسن حنفی سہسرامی اپنے عصر کے جید عالم و ماہر طبیب تھے۔ مولانا مصطفےٰ شیر دیسنوی کے تلمیذِ رشید تھے۔ حکیم حسن علی حسن کا انتقال ربیع الاول ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کو ہوا۔ (۳۰) انہوں نے زیادہ تر طب کے موضوعات پر کتابیں لکھیں تاہم ہمارے موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق ان کی کتاب ''ملخص الاخبار فی مولد سیّد الابرار'' کا ذکر ملتا ہے۔ حکیم محمد اسرار الحق اس کتاب سے متعلق لکھتے ہیں:

> یہ اردو زبان میں منظوم رسالہ ہے، جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کا شجرۂ نسب، ولادت باسعادت، معراج اور بعض غزوات کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ (۳۱)

۴: شاہ امیر الحق عمادی (۱۳۰۲ھ)

شاہ امیر الحق عمادی، شاہ ظہور الحق ظہور عمادی پھلواروی کے صاحب زادے اور جانشین تھے۔ ۱۲۲۷ھ کو پھلواری میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی سے کتب احادیث پڑھیں۔ یہ دونوں ہی بزرگ وار شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے تلمیذِ رشید تھے۔ ۱۳۰۲ھ کو وفات ہوئی۔ (۳۲) ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء کے قریب ایک مختصر کتاب ''میلاد الرسول ﷺ'' لکھی تھی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے متعلقہ واقعات بیان کئے تھے۔

۵۔ شاہ محمد یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ)

شاہ محمد یحییٰ رضوی حسینی عظیم آبادی ممتاز اصحاب طریقت سے تھے۔ ۱۲۵۴ھ میں ولادت ہوئی۔ مختلف علماء سے کسبِ علم کیا۔ اردو و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء کو وفات پائی۔ (۳۳) شاہ محمد یحییٰ نے ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء میں ''ذکرِ معراج'' کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی، جس میں معراج سے متعلقہ واقعات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی سعی کی۔

۶۔ شاہ محمد اکرم بہاری

شاہ محمد اکرم بہاری نے ایک کتاب ''مولود شریف'' لکھی جو نبی کریم ﷺ کی ولادت سے متعلق

روایتی انداز کی کتاب ہے۔ مطبع محمدی پٹنہ سے ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوئی۔ ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب گو کہ نثر میں ہے تاہم درمیان میں اشعار کی کثرت ہے۔ (۷)

۷۔ قاضی سیّد مخدوم عالم پھلواروی (م ۱۳۰۴ھ)

قاضی سیّد مخدوم عالم پھلواروی کا شمار پھلواری کے جید اور مشاہیر علما و فضلا میں ہوتا ہے۔ وہ خانقاہِ منہاجیہ کے سجادہ نشیں و متولی تھے۔ رجب ۱۲۱۶ھ کو بہ مقام پھلواری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے جد امجد قاضی سیّد شاہ عالم سے حاصل کی۔ تکمیل علم شاہ عبدالغنی محدث پھلواروی (تلمیذ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) سے کیا۔ ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی۔ (۳۵) نبی کریم ﷺ کے شمائل و اخلاق سے متعلق ایک کتاب فارسی میں تحریر فرمائی۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ خانقاہِ سلیمانیہ کی ملکیت ہے۔ انقلابات دہر نے جو تبدیلیاں بپا کیں ان سے خانقاہِ سلیمانیہ کا کتب خانہ بھی متاثر ہوا۔ چناں چہ اس کے کچھ قیمتی ذخیرے اب کراچی میں شاہ سلمان چشتی کے پاس ہیں۔ ان ہی میں متذکرہ بالا قلمی نسخہ بھی ہے۔

۸۔ مولانا حکیم ناصر علی غیاث پوری (م ۱۳۰۵ھ)

مولانا حکیم ناصر علی غیاث پوری کا شمار تیرہویں و چودہویں صدی ہجری کے معروف علما، اطباء و مدرسین میں ہوتا ہے۔ وہ غیاث پور پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ کی تکمیل لکھنؤ میں مولانا عبدالحلیم لکھنوی سے کی۔ تکمیلِ علم کے بعد آرہ میں سکونت اختیار فرمائی اور یہاں درس و افادہ اور طبابت کی ذمے داریاں نبھائیں۔ مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا حافظ ابومحمد ابراہیم آروی بانی مدرسہ احمدیہ آرہ کو مولانا موصوف سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء کو آرہ میں وفات پائی۔ (۳۷)

سیرت سے متعلق حکیم ناصر علی نے ۳ کتابیں تالیف فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ کے حلیہ مبارک پر ایک کتاب ''انوارِ ناصری'' تالیف فرمائی۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ پہلی مرتبہ مطبع علوی محمد بخش خاں لکھنؤ سے ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی۔ ۳۲ صفحات پر محیط یہ مختصر سی کتاب اپنے دور میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۹۳ھ میں مطبع گلشن محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کتاب کی زبان اور اسلوبِ بیان میں قدیم رنگ جھلکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات پر ''ناصر المحسنین فی اخلاق سیّد المرسلین ﷺ'' تالیف فرمائی۔ جو مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۸۹ھ میں طبع ہوئی۔ یہ کتاب ۱۴۰ صفحات پر محیط ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں معتبر روایات کی مدد سے رسول پاک ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کو بیان کیا گیا ہے۔

احادیث و روایات میں مذکور نبی کریم ﷺ کے مختلف ناموں پر ''ناصر اللبیب فی اسماء الحبیب ﷺ'' تحریر فرمائی۔ مطبع علوی محمد بخش خاں لکھنؤ سے ۱۲۸۹ھ میں طبع ہوئی۔ ناموں کے اندراج کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔

۹۔ مولوی محمد اسماعیل آروی (م ۱۳۰۵ھ)

مولوی محمد اسماعیل نے ''میلادِ شریف جدید'' کے عنوان سے ۶۰ صفحات پر محیط ایک کتاب تالیف کی۔ کتاب کا نام میلاد شریف جدید ضرور ہے تاہم انداز وہی روایتی اور قدیم ہے۔ پہلی بار مطبع گلزار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوئی۔ عبارت میں سادگی اور روانی ہے۔ نثر میں ہونے کے باوجود درمیان میں اشعار کی کثرت ہے۔ (۳۷)

۱۰۔ مولوی فیاض الدین پھلواروی

مولوی فیاض الدین نے روایتی انداز میں مولود شریف پر ایک کتاب ''فیض القلوب فی مولد المحبوب'' لکھی تھی جو ۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ کتاب ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب گو کہ نثر میں ہے تاہم درمیان میں اشعار کی کثرت ہے۔ زبان میں سادگی ہے۔ (۳۸)

۱۱۔ مولانا شاہ عطا حسین منعمی گیاوی (م ۱۳۱۱ھ)

شاہ عطا حسین بہار کے معروف شاعر، کثیر التصانیف عالم اور شیخ طریقت تھے۔ وہ ''خانقاہِ منعمیہ ابو العلائیہ'' گیا کے سجادہ نشیں تھے۔ ۱۲۳۲ھ کو اپنے ننہیال دانا پور میں پیدا ہوئے اور ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ کو وفات پائی۔ (۳۹) انہوں نے زیادہ تر تصوف سے متعلقہ موضوعات پر خامہ فرسائی کا فریضہ انجام دیا تاہم سیرت سے متعلق ان کی دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک ''دوازدہ مجلس رسول جمیل'' اور دوسری ''مولودِ نبی کریم ﷺ''۔ اوّل الذکر کتاب مجالسِ سیرت کے لئے لکھی گئی۔ آخر الذکر کتاب منظوم ہے، جس میں ولادت سے متعلقہ واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔

۱۲۔ مولانا علی اکرم صدیقی آروی

مولانا علی اکرم بن بن علی احسن صدیقی آروی اپنے عصر کے جید عالم و محدث، صاحبِ نظر فقیہ، کثیر الدرس مدرس اور علمائے ربانی میں سے تھے۔ انہیں فقہ حنفی پر خصوصی درک حاصل تھا اور ان کا شمار حنفی مسلک کے بلند پایہ فقہا میں ہوتا ہے۔ ۱۳ صفر ۱۲۵۸ھ کو اپنے وطنِ آبائی آرہ میں پیدا ہوئے۔ مولانا علی

اکرم نے اپنے والد کی زیرنگرانی شعور کی منزلیں طے کیں۔ انہیں اپنے زمانے کے متعدد علمائے عالی قدر سے شرف تلمذ حاصل تھا، جن میں مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی، مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، مولانا حافظ جمال الدین بن عبدالشکور بہاری، مولانا محمد فصیح غازی پوری، مولانا محمد کمال علی پوری، مولانا سید عالم علی مراد آبادی، قاری عبدالرحمان پانی پتی، مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی وغیرہم شامل ہیں۔ افسوس ہے کہ بہار کے اس جلیل القدر عالم ومحدث کے سنِ وفات سے آگاہی نہیں ہوتی۔ (۴۰)

مولانا علی اکرم کی تصانیف میں ''الجواہر الزواہر فی اسماء النبی الطاہر'' کا ذکر ملتا ہے جو ہمارے موضوعِ زیر بحث سے تعلق رکھتی ہے۔

۱۳۔ مولانا مرشد حسن کامل دھرم پوری (وفات تقریباً ۱۳۲۳ھ)

مولانا مرشد حسن کامل بن طالب حسن دھرم پوری موجودہ ضلع سمستی پور کے ایک گاؤں دھرم پور میں پیدا ہوئے۔ مولانا واجد علی بنارسی، مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہم کے شاگرد تھے۔ علوم عقلیہ میں انہیں خصوصی مہارت تھی۔ فارسی اور اردو میں شعر گوئی کا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ ۱۳۲۳ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ (۴۱) سیرت سے متعلق ان کی تصانیف میں ''میلاد النبی'' اور ''رحمتِ کامل'' کا ذکر ملتا ہے۔

۱۴۔ مولانا عبدالرحیم دانا پوری

مولانا عبدالرحیم دانا پوری کے حالات افسوس ہے کہ تلاش وبسیار کے باوجود حاصل نہیں ہو سکے۔ انہوں نے ''افضل السیر ملقب بہ ہشت گوہر'' کے عنوان سے ۸ جلدوں میں ایک کتاب تحریر فرمائی تھی۔ اس کی پہلی جلد نبی کریم ﷺ کے حالات پر محیط تھی، جو مطبع دارالسلطنت کلکتہ سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی، تعداد صفحات ۳۰۴۔ زبان وبیان میں سادگی اور روانی ہے۔ (۴۲)

۱۵۔ وزیرالدین احمد شیخ پوروی

جناب وزیرالدین احمد صاحب نے ''درِ ظہور'' کے عنوان سے ۶۰ صفحات پر محیط ایک کتاب تالیف کی۔ یہ کتاب ۱۳۱۶ھ میں انتظامی پریس کان پور سے شائع ہوئی۔ کتاب کے نصف اوّل حصے میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کا ذکر ہے جب کہ نصف ثانی میں امام اثنا عشر کے حالات لکھے ہیں۔ احوال کا بیان روایتی ہے اور عبارت پُرتکلف ورنگین ہے۔ (۴۳)

۱۶۔ غلام محمد عباس

غلام محمد عباس نے ''ذکر میلاد'' لکھی۔ ۵۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع مرتضوی پھلواری پٹنہ سے شائع ہوئی۔ کتاب روایتی انداز کی حامل ہے۔ زبان و بیان میں سادگی اور صفائی ہے۔ (۴۴)

۱۷۔ مولانا حسن بن سلیمان پھلواروی (م ۱۳۳۱ھ)

مولانا حسن بن سلیمان پھلواروی، شاہ سلیمان پھلواروی کے قابلِ فخر صاحب زادے تھے۔ ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے علاوہ مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور شاہ علی نعمت پھلواروی سے کسبِ علم کیا۔ ۲ درجن سے زائد کتابیں تالیف کیں۔ ۲۵ برس کی عمر میں ۳ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ کو وفات پائی۔ (۴۵)

شاہ سلیمان پھلواروی کی خدمتِ سیرت کا ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ شاہ سلیمان چاہتے تھے کہ اردو میں ایک مکمل کتاب سیرت پر لکھی جائے جس میں رسول اکرم ﷺ کی سیرت کا جامع تصور پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بڑے صاحب زادے شاہ حسن میاں پھلواروی کو حکم دیا کہ وہ سیرت نبوی ﷺ سے متعلق علم و تحقیق کی روشنی میں کتاب لکھنے کا آغاز کریں۔ شاہ حسن میاں نے اپنے والدِ گرامی کی تحقیقی کاوش اور بیاناتِ سیرت کی روشنی میں سیرت نبوی ﷺ کو قرطاس ابیض پر منتقل کرنے کا کام شروع کیا۔ ان کی سیرت النبی ﷺ کے کچھ اجزاء ''میلاد الرسول''، ''حبّ الرسول'' اور ''خلق حسن''، مختصر کتابوں کی شکل میں تو منظر شہود پر آئے اور مقبول بھی ہوئے، تاہم وہ ایک جامع سیرت نبوی کی تکمیل نہ کر سکے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک اچھا علمی ذخیرہ جمع کر لیا تھا مگر پیمانۂ حیات ہی چھلک پڑا اور اس آرزو کو لئے لحد میں جا سوئے۔ شاہ سلیمان نے بہ سلسلۂ وفات شاہ حسن میاں، نواب وقار الملک کو اپنے مکتوب گرامی میں لکھا کہ

حسن میاں نے سیرۃ النبی لکھنے کے لئے بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ (۴۶)

شاہ حسن کی وفات کا صدمہ ان کے والد شاہ سلیمان کو تا عمر رہا، مولانا حکیم عبدالحئی حسنی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> مجھے فقط نوجوان (شاہ حسن پھلواروی) کے گم ہونے کا صدمہ نہیں ہے، بل کہ روح فرسا صدمہ تو یہ ہے کہ علمی یادگار میرے خاندان سے کھوگئی اور میں آج علمی دنیا سے گم ہوتا ہوں۔ (۴۷)

۱۸۔ مولانا عبدالغفور داناپوری (م ۱۳۳۳ھ)

مولانا ابوالحسنات عبدالغفور داناپوری کا شمار جید عالم و مدرس اور کامیاب مناظر و مبلغ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڑھی سے کتبِ درسیہ کی تحصیل کی، جب کہ سیّد میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کی۔ ایک طویل عرصے تک ''مدرسہ اصلاح المسلمین'' پٹنہ میں تدریس کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب پر مہارت تھی۔ ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی۔ (۴۸)

سیرت سے متعلق ان کی دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے اور یہ دونوں ہی کتابیں عیسائی پادریوں کی تردید میں لکھی گئی ہیں۔ ''تبیان حسن المسیح فی وجہ المحمد من المسیح'' یہ کتاب ایک عیسائی پادری کی کتاب ''خداوند عیسیٰ مسیح اور محمد (ﷺ) کا بیان'' کے جواب میں ہے۔ مطبع احمدی پٹنہ سے ۱۳۱۴ھ میں طبع ہوئی۔ ''الرحمۃ المحیط فی اطاعۃ الفارقلیط'' پادری ایث پیٹرسن کی کتاب ''پاراکلیٹ کا بیان'' کی تردید میں لکھی، جو مطبع احمدی پٹنہ سے ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوئی، صرف ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۹۔ مولانا الٰہی بخش بڑاکری بہاری (م ۱۳۳۴ھ)

مولانا الٰہی بخش بڑاکری بہاری کا شمار ان علمائے ذی اکرام میں ہوتا ہے، جن کے دینی و علمی خدمات کے نقوش کتبِ تذکرہ و تاریخ میں اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں مگر خود ان کی زندگی کے اوراق گمشدہ ہیں۔ افسوس کسی کتبِ تذکرہ میں مولانا ممدوح کا تفصیلی ذکر خیر نظر سے نہیں گزرا۔ وہ اپنے عصر کے ممتاز افاضل سے تھے۔ ان کے قلم سے نکلنے والے کتبِ تراجم نے اپنے دور میں خاص مقبولیت حاصل کی۔ ان کے استادِ خاص سیّد میاں نذیر حسین دہلوی ان کی فکرِ علم کے معترف، ان کے معاصر فضیلتِ عمل کے قائل اور تلامذہ نسبتِ تلمذ پر مفتخر تھے۔ مولانا الٰہی بخش بہار کے سوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا الٰہی بخش کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ اس کا علم نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے کسب علم کے مختلف مراحل کی تفصیلات سے بھی آگاہی نہیں ہوتی۔ تاہم انہوں نے کتبِ درسیہ بہار کے عالم جلیل القدر علامہ علیم الدین حسین نگرنہسوی سے پڑھیں۔ کتبِ تفسیر و حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی میں شیخ الکل سیّد میاں نذیر حسین کے بابِ علم پر دستک دی۔ بہ قول امام خاں نوشہروی دہلی کے اس بارگاہِ علم و فضل میں علامہ شمس الحق محدث ڈیانوی صاحب ''عون المعبود'' اور علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی جیسے اکابر کے رفیقِ درس رہے۔

فراغتِ علم کے بعد سنبل پور (رائے پور، دکن) اور داناپور (بہار) میں ایک عرصے تک تدریس کی ذمے داریاں نبھائیں۔ مولانا الٰہی بخش بڑاکری صاحب تصنیف و تدریس بزرگ تھے۔ علم و عمل کے جامع

اور زہد وتقویٰ میں نمایاں تھے۔ محدث شمس الحق ڈیانوی نے مولانا الٰہی بخش کا شمار سید میاں نذیر حسین کے طبقۂ اوّل کے تلامذہ میں کیا ہے۔ (۴۹) مولانا الٰہی بخش نے بہ حالتِ سجدہ نماز صبح بہار شریف میں ۱۳۳۴ھ کو وفات پائی۔ (۵۰)

مولانا الٰہی بخش کے رشحات قلم سے جو نقوش صفحات ابیض پر منتقل ہوئے ان کی تعداد ہمارے دائرۂ علم کے مطابق ۱۶ ہے۔ تاہم سیرت سے متعلق ان کی ایک کتاب ''رہبر کامل'' کا ذکر ملتا ہے جو مطبوع ہے، تاہم اب کم یاب ہے۔

۲۰۔ شاہ محمد توحید زبیری الہاشمی (م ۱۳۳۶ھ)

مولانا شاہ محمد توحید بن احسان احمد زبیری ہاشمی تقریباً ۱۲۷۶ھ کو پیدا ہوئے۔ مولانا تلطف حسین عظیم آبادی، شاہ رشید الحق عمادی، علامہ عبدالحئی فرنگی محلی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، سید نذیر حسین محدث دہلوی وغیرہم سے اخذ علم کیا۔ پوری زندگی تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ اور کاشت کاری وملازمت میں گزاری۔ مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے تاہم اپنے نام کے ساتھ اہل حدیث نعمانی لکھا کرتے تھے۔ ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء کو وفات پائی۔ (۵۱) سیرت سے متعلق ان کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کا ذکر ملتا ہے جس کا مکمل نام تھا ''سیرت محمدی عن کتب سماوی بلسان توحیدی دررۂ نصاریٰ ویہود''۔

۲۱۔ محمد اشرف علی اشرف قادری

محمد اشرف علی اشرف نے ''حدیقۂ خاتم النبیین'' کے عنوان سے ۴۳ صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی، جو پہلی مرتبہ مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں رسول پاک ﷺ کی سیرت مبارکہ کو نظم ونثر میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا انداز روایتی، زبان سادہ اور سپاٹ ہے۔ تذکیر وتانیث کی متعدد غلطیاں ہیں۔ (۵۲)

۲۲۔ مولانا حافظ نذر الرحمان حفیظ عظیم آبادی (م ۱۳۴۳ھ)

حفیظ عظیم آبادی بہار کے مشہور صوفی، عالم اور شاعر تھے۔ ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء کو محلہ مغلپورہ پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ وہ شمس العلماء مولانا شاہ محمد سعید حسرت کے نواسے اور جانشین تھے۔ قاری عبدالرحمان پانی پتی اور مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے تلمیذ رشید تھے۔ ۱۳۱۳ھ اور ۱۳۲۵ھ میں فریضۂ حج کی ادائیگی کی۔ ادائیگی حج کے موقع پر مولانا موصوف نے وہاں کے علماء ومشائخ سے استفادہ کیا اور اجازت حدیث

حاصل کی۔ حفیظ بہار میں اردو و فارسی کے معروف شاعر تھے۔ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ (۵۳)
مولانا نے مولود شریف کے رسائل میں موضوعات کی کثرت دیکھتے ہوئے ایک کتاب ''وسیلۃ النجات فی ذکر ولادۃ اشرف المخلوقات'' تحریر فرمائی۔ یہ کتاب مطبع مفید عام لکھنؤ سے ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی، تعداد صفحات ۴۲۔ سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولف لکھتے ہیں:

فی زمانہ جتنے رسالے مولود شریف کے رائج ہیں وہ عموماً ضعیف روایتوں اور موضوعات سے مملو نظر آتے ہیں۔ کوئی رسالہ ایسا نہیں جو قرآن اور حدیث کے مطابق تطبیق دیا گیا ہو۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے میرے اکثر احباب خصوصاً جناب محترم ڈاکٹر علی احمد صاحب اسسٹنٹ سرجن پٹنہ سٹی ہاسپٹل نے مجھے ایک ایسے رسالے کے لکھنے کے لئے مجبور کیا جو ان صفات سے متصف ہو۔ رسالہ میں جا بہ جا قصائد اور نظمیں بھی جناب ڈاکٹر صاحب موصوف کی فرمائش سے درج کی گئی ہیں اور وہ بھی مضامین احادیث سے الگ نہیں ہیں۔ (۵۴)

ڈاکٹر مظفر اقبال لکھتے ہیں:

میلاد النبی ﷺ کی عام کتابوں کے برعکس اس میں سارے واقعات معتبر اور مستند کتابوں کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں اور مآخذ کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ عبارت نظم و نثر دونوں ہی پر مشتمل ہے۔ زبان و بیان میں سادگی اور صفائی ہے۔ (۵۵)

۲۳۔ مولانا ابو طاہر بہاری (م ۱۳۴۵ھ)

مولانا ابو طاہر بہاری بہار کے جید اہلِ حدیث عالم و مدرس تھے۔ انہیں مولانا الٰہی بخش بڑا کری اور علامہ حافظ عبداللہ غازی پوری جیسے اکابر سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ان کی فضیلتِ علمی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مدرسہ احمدیہ آرہ اور مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ مولانا ابو طاہر کی وفات ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء کو ہوئی۔ (۵۶) کفارِ اسلام کی جانب سے نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر جو مختلف اعتراضات کئے جاتے ہیں مولانا نے اس کی تردید میں ایک کتاب ''سوط النبی علیٰ معترض النبی ﷺ'' تالیف فرمائی تھی۔

۲۴۔ مولانا ابو محمد عبداللہ چھپراوی (م ۱۳۴۸ھ)

مولانا حافظ ابو محمد عبداللہ چھپراوی کا شمار براعظم کے عظیم المرتبت علمائے ذی اکرام میں ہونا چاہیے، مگر افسوس کہ ہماری علمی دنیا بھی صحیح طور سے ان کی خدمات سے واقف ہے اور نہ ہی ان کے نام

سے آگاہ۔ مولانا نے مفتی محمد یوسف فرنگی محلی اور سیّد میاں نذیر حسین محدث دہلوی کی بارگاہِ علم وفضل میں کسبِ علم کے مراحل طے کیے۔ کثیر الجہت جامع العلوم شخصیت کے حامل تھے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کے ساتھ ساتھ عبرانی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ انجیل وتوریت ونیز ہنود کے مذہبی صحائف پر بھی گہری نظر تھی۔ تقابلِ ادیان خاص موضوع تھا۔ پہلے پہل تراجم قرآن کا ناقدانہ جائزہ لینے کا خیال موصوف ہی کے ذہن میں آیا، چناں چہ اس ضمن میں ان کی تصنیف البیان لتراجم القرآن لائقِ ذکر ہے۔ یکم رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ کو وفات پائی۔ (۵۷)

سیرت سے متعلق ان کی تحریری خدمات میں ''شق القمر معجزۃ سیّد البشر'' ایک اہم تصنیف ہے۔ اس تالیف کا پسِ منظر یہ ہے کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے نبی اکرم ﷺ کے بعض معجزات پر اعتراضات کیے تھے۔ مولانا موصوف نے ان اعتراضات کا شافی جواب دیا ہے۔ یہ کتاب مفید عام پریس آگرہ سے ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوئی، تعداد صفحات ۱۰۰۔ اس کے علاوہ مولانا نے مشہور مستشرق موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب ''تمدن عرب'' پر ''اصلاح التمدن'' کے عنوان سے تنقید کی ہے اس میں بھی بعض مباحث سیرت آگئے ہیں۔

۲۵۔ مولانا شمس الحق کٹونوی

بہار میں صادق پوری خانوادے کی تحریکِ جہاد سے جو علاقے خاص طور پر متاثر ہوئے ان میں عظیم آباد پٹنہ کا محلّہ کٹونہ بھی ہے۔ اس محلے میں ایک صادق پوری خاندان کا عقیدت مند ایک اہلِ حدیث گھرانہ عزت وشرافت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس گھرانے کے ایک فرد جناب مولانا شمس الحق نے ''سیرت النبی'' کے عنوان سے فارسی میں ایک کتاب تالیف فرمائی تھی، جو ایک زمانے میں بہار میں بڑی مقبول ہوئی۔ (۵۸)

۲۶۔ مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی (م ۱۳۵۴ھ)

مولانا شاہ محمد سلیمان بن داود پھلواروی برِاعظم پاک وہند کے معروف عالم دین، مشہور شیخ طریقت اور صفِ اوّل کے مسلم زعما میں سے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے ہر طبقے میں مقبولیت حاصل تھی اور وہ ہر طبقے میں یک ساں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ اہلِ حدیث، حنفی اور صوفی تینوں طبقے سے تعلق رکھنے والے اعیان کے مستفید یافتہ تھے۔ سیّد میاں نذیر حسین محدث دہلوی مولانا حکیم عبد الحمید صادق پوری، مولانا عبد الحیٔ حنفی فرنگی محلی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، شاہ فضلِ رحمان گنج مراد آبادی وغیرہم سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

شاہ سلیمان پھلواروی کی خدمتِ سیرت کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ انہوں نے ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں ''تحریکِ سیرت'' کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد عوام الناس میں سیرت النبی کے مطالعے کو عام کرنا اور خواص میں سیرت سے متعلق تحقیق وجستجو کے جذبات کی پرورش کرنا تھا۔ وہ باوجود خواہش سیرت النبی ﷺ پر کوئی جامع کتاب نہ لکھ سکے، تاہم ان کے ایماء پر ان کے بڑے صاحب زادے شاہ حسن میاں نے سیرت نبوی ﷺ کو قلم بند کرنے کا بیڑا اٹھایا، تاہم افسوس کہ وہ بھی اس خواہش کی تکمیل سے قبل ہی اپنے والد شاہ سلیمان کی زندگی ہی میں لحد میں جا اترے۔ اس کے بعد شاہ سلیمان کے چھوٹے صاحب زادے شاہ محمد جعفر نے سیرت پر دو کتابیں ''تذکرۂ جمیل'' اور ''پیغمبر انسانیت'' تالیف فرمائیں۔ تاہم یہ کتابیں شاہ سلیمان کی وفات کے بعد منصۂ شہود پر آئیں۔ شاہ سلیمان پھلواروی کی وفات ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ (۵۹)

شاہ سلیمان پھلواروی نے ''ذکر الحبیب ﷺ'' اور ''رسالۃ فی الصلاۃ والسلام'' تالیف کی تھیں۔ جو مجالسِ سیرت میں پڑھی جاتی تھیں۔

۲۷۔ سیّد مرتضیٰ حسن رضوی شفق عماد پوری (م ۱۳۶۳ھ)

سید حسن مرتضیٰ متخلص بہ شفق ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے۔ شفق عماد پوری کا شمار بہار کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے۔ انہیں نظم ونثر دونوں پر یک ساں عبور حاصل تھا۔ ۱۳۶۳ھ میں موصوف کی وفات ہوئی۔ (۶۰)

شفق عماد پوری نے سیرت نبوی ﷺ پر روایتی انداز میں ایک کتاب حدیقۂ آخرت تالیف کی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ شفق عماد پوری کو تحریر وانشا میں کمال حاصل تھا، ان کے مخصوص انداز تحریر کی وجہ سے کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں اصل کتاب میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس اضافہ شدہ حصے کا نام ''توشۂ آخرت'' رکھا گیا۔ یہ مختصر سی کتاب اندازِ بیان کے اعتبار سے نہایت مؤثر ثابت ہوئی اور بہت مشہور ہوئی۔ ڈاکٹر مظفر اقبال لکھتے ہیں:

> شفق عماد پوری اپنے دور کے مشہور شاعر، انشاء پرداز اور خطیب تھے۔ ان کا یہ وصف اس کتاب سے بھی ظاہر ہے۔ عبارت نظم ونثر دونوں پر مشتمل ہے اور اس میں پختگی، روانی اور سلاست کے علاوہ خطابت بھی ہے۔ (۶۱)

۲۸۔ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری (م ۱۹۴۸ء)

مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری کا شمار اپنے وقت وسیع النظر عالم اور انتہائی فعال مذہبی و

سیاسی زعما میں ہوتا ہے۔ ۱۸۵۶ء کو داناپور میں پیدا ہوئے۔ مختلف علما سے کسبِ علم کیا۔ مولانا انگریزی سامراجیت کے سخت مخالف تھے۔ اکثر برطانوی حکومت کے زیرِ عتاب بھی رہتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا داناپوری، مولانا ابوالکلام آزاد، سبھاش چندر بوس و دیگر رہنما کے ساتھ چھ ماہ قید میں رہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتے میں گزارا۔ یہیں ان کی علمی زندگی پروان چڑھی اور یہیں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ملّی و سیاسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۸ء میں کلکتہ میں وفات پائی اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ (۶۲)

مولانا کی مشہور کتاب ''اصح السیر'' کا ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا نے ''مختصر سیرت نبوی ﷺ'' کے نام سے بھی ایک کتاب تالیف فرمائی تھی۔ یہ کتاب ۴۴ صفحات پر مشتمل تھی اور پہلے پہل ستارۂ ہند پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ سنِ طباعت درج نہیں تاہم اندرونی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ طباعت پذیر ہوئی تھی۔

۲۹۔ مولانا غلام مصطفےٰ فخر سہسرامی (م ۱۳۶۹ھ)

مولانا غلام مصطفےٰ صدیقی سہسرامی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۰ء کو محلہ پٹھان ٹولی سہسرام میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ''مدرسہ خانقاہِ کبیریہ'' سہسرام، ''دارالعلوم'' کان پور اور ''دارالعلوم'' دیوبند میں کسبِ علم کے مراحل طے کئے۔ ان کے مشہور اساتذہ میں مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی، مولانا عبدالوہاب بہاری اور مولانا محمود الحسن دیوبندی وغیرہم شامل ہیں۔ مولانا غلام مصطفےٰ کو شاعری سے بھی خاص شغف تھا فخر اور شفا تخلص فرماتے تھے۔ انہوں نے ۱۵ کے قریب کتابیں تالیف کیں۔ ۱۳ جمادی الاول ۱۳۶۹ھ/۳ مارچ ۱۹۵۰ء کو ضلع ریوان (مدھیہ پردیش) میں وفات پائی۔ (۶۳) نبی کریم ﷺ کی رضاعی والدہ محترمہ بی بی حلیمہ نے نبی کریم ﷺ کے جو برکات ملاحظہ فرمائے اور جن اوصاف کا تجزیہ کیا مولانا موصوف نے اسے کتابی شکل میں تحریر فرمایا ہے جس کا نام ''جمالِ مصطفائی قصہ حلیمہ دائی'' ہے۔

۳۰۔ مولوی عبدالحکیم بسمل بہ پوروی

ان کی ایک سیرت سے متعلق ایک کتاب ''گلدستہ شفاعت معروف بہ شگوفۂ رحمت'' کا ذکر ملتا ہے جو مطبع الپنچ بانکی پور سے شائع ہوئی تھی، تعداد صفحات ۳۲، سنِ طباعت ندارد۔

۳۱۔ سیّد عدیل اختر گیاوی (م ۱۹۵۱ء)

سیّد عدیل اختر بہار کے معروف شیعہ عالم و مبلغ تھے۔ انہیں اردو کے علاوہ بنگلہ، ہندی، انگریزی،

سنسکرت، فارسی، عربی اور مختلف سواحلی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے بہ سلسلۂ تبلیغ بنگلہ دیش، کشمیر، جزائر افریقہ، برما، تبت اور پاکستان کے دورے کئے۔ ان کی وفات ۱۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو ہوئی تھی۔ (۶۴) سیرت سے متعلق ان کی کتاب ''خیر البشر'' کا ذکر ملتا ہے۔

۳۲۔ مولانا علی چھپروی

مولانا علی مہدانوای ثم چھپروی کا شمار بہار کے مشہور اہلِ حدیث زعما میں ہوتا ہے۔ انہیں سیاسی اعتبار سے بھی بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان کے والد مولانا عبدالغفار نشر مہدانوی، سیّد میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ خود مولانا علی نے مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی سے اکتسابِ علم کیا تھا۔ ملک کے اکابر سیاسی زعما مثلاً سر علی امام، موہن داس کرم چند گاندھی، بیرسٹر عبدالعزیز، ڈاکٹر سیّد محمود سے موصوف کے گہرے مراسم تھے۔ افسوس کہ مولانا کی سنینِ ولادت و وفات سے آگاہی نہ ہوسکی۔ سیرت سے متعلق ان کی ایک مختصر کتاب ''خلقِ عظیم'' کا ذکر ملتا ہے جو العدیل پریس، بانکی پور سے شائع ہوئی تھی۔ تعداد صفحات ۶۴۔ (۶۵)

۳۳۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء)

علامہ سیّد سلیمان ندوی کو برّصغیر کا کون سا ایسا صاحبِ علم ہے جو نہیں جانتا؟ وہ اقبال کی زبان میں ''استاذ الکل'' اور ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد'' تھے۔ (۶۶) اہلِ علم کے ایک کثیر طبقے کی رائے کے مطابق برّصغیر کے سب سے بڑے سیرت نگار تھے۔ جانشینِ شبلی تھے۔ ندوۃ العلماء کا سرمایہ اور دارالمصنفین کی عزت تھے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء/ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو دیسنہ ضلع پٹنہ (موجودہ ضلع نالندہ) میں پیدا ہوئے۔ نسباً رضوی الحسینی تھے۔ ابتدائی تعلیم پھلواری میں شاہ محی الدین پھلواروی سے حاصل کی۔ پھر مدرسہ امدادیہ دربھنگہ سے ۱۹۰۰ء میں درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرف شدِ رحال کیا۔ برّصغیر کی سب سے بڑے علمی و تحقیقی مرکز دارالمصنفین کے صدر نشیں تھے۔ اعلیٰ ترین علمی مجلّے معارف کے مدیر تھے۔ ان کا نام جس کتاب سے منسلک ہوا وہ کتاب معتبر بن گئی۔ جس ادارے سے منسلک ہوئے وہ ادارہ ذرّے سے آفتاب بن گیا، جس موضوع پر لکھا اس قدر تحقیق سے لکھا کہ اسے نظر انداز کرنا ہی غیر ممکن ہوگیا۔ سیرت کے ہمہ جہت پہلو ہوں یا ارضِ قرآنیات کا ذخیرہ۔ امّ المومنین صدیقہ کائنات کی مقدس زندگی ہو یا عمر خیام کی فلسفیانہ ترکتازیاں اور رباعیات۔ الغرض کسی بھی مقام پر ''تحقیقِ سلیمانی'' سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ سیّد سلیمان نے اپنی بھرپور علمی و تحقیقی زندگی گزار کر ۲۲ نومبر

۱۹۵۳ء کو کراچی میں وفات پائی۔(۶۷)

سیرت سے متعلق سیّد سلیمان کی ۳ کتابیں علمی دنیا کا قیمتی ذخیرہ ہیں۔شبلی نعمانی کے نا تکمیل پذیر ذخیرۂ سیرت کی تکمیل ''سیرۃ النبی ﷺ'' سیّد سلیمان کا علمی شاہ کار ہے۔سیرت سے متعلقہ لکچر جو'' خطبات مدراس'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔تحقیق وخطابت کی عمدہ مثال ہے۔جب کہ کم علم افراد اور ابتدائی طلبہ کے لئے رحمتِ عالم ﷺ لکھ کر سیّد سلیمان نے ایک اہم ضروت کو پورا کیا ہے۔یہ تینوں ہی کتابیں بار ہا شائع ہوئی ہیں اور اہل علم وعوام الناس نے ان سے بہ کثرت استفادہ کیا ہے۔

۳۴۔حافظ محبّ الحق عظیم آبادی (وفات تقریباً ۱۹۵۵ء)

شمس العلماء مولانا حافظ محبّ الحق عظیم آبادی ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ان کے بڑے بھائی حافظ سیّد فضل حق آزاد اپنے عہد کے مشہور شاعر تھے۔حافظ محبّ الحق بھی اپنے ذوقِ علم کی بدولت بہار اور بہار سے باہر نمایاں مقام کے حامل ہوئے۔انکار حدیث کے علم برداروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ان کی تصنیفات کو منکرینِ حدیث کے حلقے میں خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔حال ہی میں ان کی ایک کتاب ''شرعۃ الحق'' شائع ہوئی ہے۔غلام احمد پرویز نے ان کی وفات پر تعزیتی شذرہ بھی قلم بند کیا تھا۔علامہ اقبال کی شکوہ کے جواب میں انہوں نے ''جواب شکوہ'' لکھی تھی۔(۶۸)

سیرت کے حوالے سے انہوں نے ''میلاد النبی ﷺ'' کے عنوان سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ ۸۰ صفحات پر محیط اس کتاب میں مولف نے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اس سلسلے میں قرآن شریف، کتب احادیث وسیر کے علاوہ دوسرے آسمانی صحیفوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔زبان وبیان میں سادگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ خطابت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

۳۵۔مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی (م ۱۳۷۵ھ)

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی اپنے عہد کے جید عالم، سحر البیان مقرر، نکتہ آفریں محقق اور معقول و منقول کے جامع تھے۔۱۳۱۰ھ کو اپنی ننہیال استھانواں میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم خاندانی بزرگوں سے حاصل کی۔۸ برس مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی کی زیر نگرانی کتبِ درسیہ ومعقولات کی کتابیں پڑھیں۔۱۹۳۱ء میں دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں شرکت کی۔مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اصغر حسین دیوبندی وغیرہم سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ/ ۵ جون ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔(۶۹) سیرت سے متعلق ان کی ایک کتاب النبی الخاتم

ہے جو کتبِ سیرت میں اپنی انفرادی شان رکھتی ہے۔

۳۶۔ مولانا منظور الحق جھومکوی (م ۱۹۶۲ء)

مولانا منظور الحق ۱۸۹۵ء کو ضلع چمپارن کے ایک گاؤں جھمکا میں پیدا ہوئے۔ مولانا نے مدرسہ اصلاح المسلمین پٹنہ، جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو اور مدرسہ علی جان دہلی میں اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ معروف اساتذۂ کرام میں مولانا کفایت حسین عظیم آبادی، مولانا احمد اللہ محدث دہلوی اور مولانا عبد الوہاب صدری دہلوی شامل ہیں۔ مولانا نے کم و بیش ۳۰ کتابیں تالیف فرمائیں۔ مولانا کا انتقال ۱۹۶۲ء کو ہوا (۷۰) سیرت سے متعلق موصوف کی ایک کتاب ''پاک مولود'' کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ''پیارے نبی ﷺ کا پیارا خطبہ'' تحریر فرمائی جو حمیدیہ برقی پریس دربھنگہ سے شائع ہوئی، تعداد صفحات ۱۳۶۔

۳۷۔ مولانا محمد ایوب شکروی (م ۱۹۶۵ء)

مولانا محمد ایوب ۱۸۹۵ء کو ضلع مدھوبنی کے اطراف میں واقع ایک مقام شکری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ میں کیا، جب کہ تکمیلِ علم کے مراحل دار العلوم دیوبند میں طے کئے۔ ۱۹۲۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ تدریس و تبلیغ کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۶۵ء کو شکری میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (۷۱) مولانا نے سیرت کے موضوع پر ایک کتاب تالیف فرمائی جو طبع نہ ہو سکی اور بعد ازاں اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔

۳۸۔ مولوی عبد الغنی غنی عظیم آبادی

مولوی عبد الغنی غنی ۱۸۷۱ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ بعض کتبِ درسیہ کی تحصیل مولانا حکیم عبد الحمید پریشاں صادق پوری سے کی۔ کلکتے میں مولانا غلام عبد الوہاب بہاری سے اخذِ علم کیا۔ ''مدرسہ محمدیہ'' پٹنہ میں مولانا حکیم محمد ادریس قرنی سے تکمیل و فراغت کی۔ ایک عرصے تک مدرسہ قاسمیہ کلکتہ کے مدرس اوّل رہے۔ شاعری سے بھی شغف تھا۔ شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ چند ایک کتابیں تالیف کیں۔ جن میں ''میلادِ ذکرِ گوہرِ مقبول'' اور ''معراج فخر کونین'' کا تعلق ہمارے موضوعِ زیرِ بحث سے ہے۔ (۷۲)

۳۹۔ مولانا عبد الصمد رحمانی (م ۱۳۹۳ھ)

مولانا عبد الصمد رحمانی کا شمار ماضی قریب کے جید و مشہور بہاری علما میں ہوتا ہے۔ مولانا عبد الصمد اپنے دور کے انتہائی فعال علما میں سے تھے۔ انہیں مولانا ابو المحاسن سجاد سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جب کہ ان

کا شمار مولانا محمد علی مونگیری کے اہم خلفا میں ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنے دور کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۶۰ سے زائد کتابیں تالیف کیں۔ ۱۴ مئی ۱۹۷۳ء/ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ کو خانقاہِ رحمانی مونگیر میں وفات پائی۔ (۷۳) مولانا نے سیرت نبوی ﷺ سے متعلق ایک کتاب ''پیغمبر عالم'' تالیف کی تھی۔

۴۰۔ پروفیسر محمد مسلم صادق پوری (م ۱۹۷۷ء)

پروفیسر محمد مسلم کا تعلق صادق پور پٹنہ کے مشہور عالم مجاہد خانوادے سے تھا۔ وہ امیر المجاہدین مولانا عنایت علی صادق پوری کے پڑپوتے تھے۔ ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن مہر مادری اور لڑکپن شفقتِ پدری سے محروم گزرا۔ کچھ عرصہ مدرسہ احمدیہ آرہ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر صادق پور میں مولانا عبد السلام مبارک پوری سے اخذِ علم کیا۔ اورینٹل کالج لاہور سے ایم، اے اور ایم، او، ایل کیا۔ پٹنہ، بزاری باغ اور کراچی میں درس و تدریس کی ذمے داریاں نبھائیں۔ شاعری میں مسلم تخلص تھا اور شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ۵ فروری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں وفات پائی۔ (۷۴)

پروفیسر مسلم نے دینی، علمی و ادبی موضوعات پر بھرپور خامہ فرسائی کی۔ انہوں نے متعدد تخلیقات نظم و نثر کو سپردِ قرطاس کیا۔ سیرت کے حوالے سے ان کی اہم کتاب ''ذکر حبیب ﷺ'' ہے۔ جس میں پروفیسر مسلم نے نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ اس کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر فرمایا تھا۔

۴۱۔ مولانا عبد المتین بہاری (م ۱۴۰۰ھ)

مولانا عبد المتین بہاری ۱۹۰۲ء میں محلہ بسیار بیگہہ بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف سے فارغ التحصیل تھے۔ مسلک و نظریات کے اعتبار سے بریلوی تھے۔ متعدد کتابیں تالیف کیں۔ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء کو وفات پائی۔ (۷۵) نبی کریم ﷺ کی ولادت سے متعلقہ روایات کو آپ نے ''میلاد مصطفےٰ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔

۴۲۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی (م ۱۴۰۲ھ)

مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی، برصغیر میں تحریکِ سیرت کے بانی شاہ محمد سلیمان پھلواروی کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ شاہ محمد جعفر تحریر و تقریر میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے دینی و دنیاوی دونوں علوم کی تحصیل کی۔ ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۴ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے۔ ندوۃ العلماء سے تکمیلِ

فراغت کی۔ اپنے برادر بزرگ شاہ حسین میاں پھلواروی کی وفات کے بعد خانقاہِ سلیمانیہ کے سجادہ نشیں ہوئے۔ تاہم بعدازاں مسلکِ تصوف کو ترک کردیا تو سجادگی کا سلسلہ بھی اختتام پذیر ہوا۔ تقریباً ۱۷ برس ریاست کپورتھلہ میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور میں اقامت گزیں ہوئے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان سے منسلک ہوکر دینی خدمات انجام دیں۔ ۱۴۰۲ھ/۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو کراچی میں وفات پائی۔ (۷۶) سیرت سے متعلق مولانا کی دو کتابیں ''پیغمبر انسانیت'' اور ''تذکرۂ جمیل'' فنِ سیرت نگاری میں خاص مقام کی حامل ہیں۔

۴۳۔ مولانا عبیدالرحمان عاقل رحمانی (م ۱۴۰۲ھ)

مولانا عبیدالرحمان عاقل ماضی قریب کے فلسفی مزاج عالم ومتکلم اور مدرس ومصنف تھے۔ ۱۹۱۰ء کو دربھنگہ کے اطراف میں واقع ایک بستی پیغمبر پور میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ اور دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں کسبِ علم کے مراحل طے کیے۔ حدیث کی انتہائی کتابیں شیخ الحدیث مولانا احمداللہ دہلوی سے پڑھیں۔ ایک طویل عرصے تک دارالعلوم دارالسلام عمرآباد میں صدر مدرس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ علامہ طنطاوی کی الجواہر فی القرآن کا اردو ترجمہ موصوف کا علمی کارنامہ ہے۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء کو وفات پائی۔ (۷۷) مولانا نے کارلائل کی مشہور کتاب ''ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ'' کے اس حصے جس کا تعلق نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے ہے، کا اردو ترجمہ ''محمد رسول اللہ ﷺ'' کے عنوان سے کیا تھا۔

۴۴۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی (م ۱۴۰۲ھ)

پروفیسر عبدالمنان بیدل کا تعلق عظیم آباد کے اطراف میں واقع مشہور بستی ڈیانواں سے ہے۔ شارح سنن ابی داود علامہ شمس الحق محدث ڈیانوی کی ذات گرامی تمام عالم اسلام میں اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے مشہور ومعروف ہے۔ ان کا تعلق بھی یہیں سے تھا۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل کو ان سے رشتۂ قرابت بھی حاصل تھا۔ پروفیسر صاحب یکم جولائی ۱۸۹۴ء کو ڈیانواں میں پیدا ہوئے۔ وہ جدید تعلیم سے سیراب ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے کلکتہ یونی ورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ انہیں انگریزی، فارسی اور اردو میں یکساں مہارت تھی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ اور پٹنہ یونی ورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۴۰۲ھ/۲۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو ان کی علمی وادبی زندگی اختتام پذیر ہوئی اور انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ (۷۸) پروفیسر عبدالمنان بیدل نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے بیش تر کا تعلق شعروادب سے ہے تاہم ہمارے موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق ان کی ایک کتاب ''خاندانِ رسول کریم ﷺ'' کا ذکر ملتا ہے۔

۴۵۔ مولانا نظام الدین پھلواروی (م ۱۴۰۲ھ)

مولانا شاہ نظام الدین بن بدر الدین پھلواروی ۲۲ صفر ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء کو پھلواری میں پیدا ہوئے۔ وہ خانقاہِ مجیبہ پھلواری کے سجادہ نشیں اور امارتِ شرعیہ بہار کے امیر شاہ بدر الدین پھلواروی کے صاحب زادے تھے۔ مدرسہ مجیبیہ سے تکمیل علم کیا۔ درس و تدریس اور تحریر و تالیف سے اچھی دل چسپی تھی۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء کو وفات پائی۔ (۷۹) مولانا حکیم محمد شعیب پھلواروی سیرت کے حوالے سے موصوف کی کاوش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کانپور کے ایک رسالہ نے عصمت انبیاء کے خلاف کچھ مضامین شائع کئے، جس کا آپ نے نہایت مدلل جواب دیا جو اسی پرچے کے چند نمبروں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد آپ نے عصمت انبیاء کے متعلق پُر از معلومات مضامین لکھے جو الفقیہ امرتسر کے پرچوں میں عرصہ تک شائع ہوتے رہے۔ ان سب کو مرتب کر کے جمع کر دیا جائے تو اس موضوع پر ایک مدلل رسالہ تیار ہو جائے گا۔ (۸۰)

۴۶۔ شاہ محمد قائم قتیل داناپوری (م ۱۹۸۵ء)

قتیل داناپوری کا شمار بہار کے مشہور شعراء و اصحابِ علم میں ہوتا ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء کو داناپور کے مشہور علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے خاندانی بزرگوں سے کسبِ علم کے مراحل طے کئے۔ کثیر التصانیف مصنف اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ۲۷ جولائی ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔ (۸۱)

سیرت سے متعلق ان کی ۳ کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ ''نور مجسم'' جو برقی مشین پریس بانکی پور پٹنہ سے ۱۳۶۸ھ میں شائع ہوئی، تعداد صفحات ۱۶۔ ''مصلح آخرت''، لیبل لیتھو پریس پٹنہ سے ۱۳۶۹ھ میں شائع ہوئی، تعداد صفحات ۳۲۔ جب کہ تیسری کتاب ''سیّد العرب والعجم'' ہے۔

۴۷۔ مولانا لطف الرحمان ہرسنگھ پوری (م ۱۴۰۸ھ)

مولانا لطف الرحمان ۱۹۱۰ء کو دربھنگہ کے اطراف میں واقع ایک گاؤں ہرسنگھ پور میں پیدا ہوئے۔ مولانا اور ان کا خانوادہ دیوبندی فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی لئے موصوف نے تکمیل علم کے مراحل دار العلوم دیوبند میں طے کئے۔ تکمیل علم کے بعد جمعیت علمائے ہند سے وابستہ ہوئے۔ مولانا کا انتقال ۱۴۰۸ھ/۴ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ہرسنگھ پور میں ہوا۔ (۸۲) نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ پر مولانا ممدوح نے ''سیرت

حبیب خدا ﷺ'' کے عنوان سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔

۴۸۔مولانا عبدالقدوس ہاشمی (م ۱۴۰۹ھ)

مولانا عبدالقدوس ہاشمی کا شمار ماضی قریب کے مشاہیر علما میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۱ء کو مخدوم پور (گیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی مولانا سیّد اوسط حسین بہاری، سیّد میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ خود انہیں مشہور محدث علامہ عبدالرحمان مبارک پوری اور مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ندوۃ العلماء میں بھی کسبِ علم کے مراحل طے کئے۔ مولانا نے مختلف علمی و تحقیقی کام انجام دیئے اور علمی اداروں سے وابستہ رہے۔ مولانا کی وفات ۱۴۰۹ھ/ ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء کو کراچی میں ہوئی۔ (۸۳)

انہوں نے سیرت پر کوئی مستقل کتاب تو تالیف نہیں کی تاہم اس موضوع پر متعدد مضامین و مقالے لکھے، جنہیں یک جا کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ مستشرقین نے جو اعتراضات سیرت کے حوالے سے پیش کئے ہیں مولانا نے اپنے ایک مضمون ''مستشرقین اور تحقیقات اسلامی'' میں اس کا جواب دیا ہے، یہ رسالہ بعد ازاں کتابچے کی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اسی طرح جناب اقبال احمد صدیقی نے مولانا ہاشمی کے مقالات و ملفوظات کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس میں خلقِ عظیم (بہ سلسلۂ اسوۂ رسول ﷺ)، نبی کریم ﷺ کی معاشی اصلاحات، اتباع رسول اور نعت اور قصائد نبوی کی تاریخ کا سیر حاصل جائزہ کے عنوان سے مولانا ہاشمی کے رقم کردہ مضامین بھی شامل اشاعت ہیں۔

۴۹۔مولانا سیّد طاہر رسول قادری

مولانا سیّد طاہر رسول قادری ۱۹۲۳ء کو موضع بلیاری ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے گیا، سہسرام اور پٹنہ کے مشہور مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کی۔ وہ صحافت کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک ''ادارہ معارف اسلامی'' کراچی سے منسلک رہے۔ ایک درجن سے زائد کتابیں تالیف کیں۔ جن میں ''آں حضرت ﷺ کا طریقۂ تبلیغ'' ہمارے موضوعِ زیرِ بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ (۸۴)

۵۰۔مولانا حسن مثنیٰ ندوی (م ۱۹۹۸ء)

مولانا سیّد حسن مثنیٰ کے دادا بزرگ وار شاہ محمد سلیمان پھلواروی اور والد گرامی مولانا شاہ حسن

پھلواروی اپنے عہد کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ جنہوں نے ایک طرح سے براعظم میں تحریک سیرت کو پروان چڑھانے میں ابتدائی کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ مولانا حسن مثنیٰ ۱۸ جنوری ۱۹۱۳ء کو اورنگ آباد (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پھلواری میں حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی صحافتی زندگی کا آغاز خواجہ حسن نظامی کے رسالے ''منادی'' کے مجلسِ ادارت میں شامل ہوکر کیا۔ ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اسی سال بنگلور سے ہفت روزہ پاسبان کا اجرا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے ادبی جریدہ مہر نیمروز جاری کیا جس نے ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء میں روزنامہ ''حریت'' سے وابستہ ہوئے جہاں ان کے لکھے گئے اداریوں نے ملک کے سیاسی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل کی۔ ان کے تحریری سرمایے میں تصنیف و تالیف بھی ہے اور تراجم بھی۔ ان کی تصانیف میں ''پاکستان مخالفین کی نظر میں''، ''چہ دلاور است''، ''اسلام کا تصور اجتماع''، ''براعظم کے خادمانِ سیرت''، ''خواتین قرآن'' وغیرہا شامل ہیں۔ تاہم ان کی بیش تر کتابیں مضامین کی شکل میں ہیں اور ہنوز کتابی شکل میں شائع نہیں ہوسکی ہیں۔ یکم مارچ ۱۹۹۸ء کو مولانا حسن مثنیٰ نے کراچی میں وفات پائی۔ (۸۵)

مولانا نے ایک مقالہ ''براعظم کے خادمانِ سیرت'' کے عنوان سے لکھا جو پہلے پہل ان کے چچا شاہ محمد جعفر پھلواروی کی کتاب ''پیغمبر انسانیت'' کی ابتدا میں بہ طور مقدمہ شائع ہوا۔ بعد میں جب ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے ''پیغمبر انسانیت'' کو مختلف مقامات سے حذف کر کے شائع کیا تو اس تحریف کی زد میں مولانا حسن مثنیٰ کا مقدمہ بھی آ گیا اور اب موجودہ اشاعتوں میں اس مضمون کو بہت مختصر کر دیا گیا ہے۔ خود مولانا نے اس مضمون کو اضافوں کے ساتھ بعد میں اپنے جریدے ''مہر نیمروز'' میں بھی شائع کیا تھا۔

اسی طرح امّ المومنین سیّدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا شمار نبی کریم ﷺ کی کنیز میں ہوتا ہے یا ازواج میں۔ اس موضوع پر بھی مولانا خامہ فرسائی کی تھی۔ جو ''مہر نیمروز'' میں شائع ہوئی تھی اور اب حال ہی میں راقم کے تقدیم و حواشی کے ساتھ کتابی شکل میں مکتبہ دارالاحسن کراچی سے ۲۰۱۰ء میں طباعت پذیر ہوئی ہے۔

سیرت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر انہیں نے متعدد مقالات و مضامین لکھے جو زیادہ تر ان کے جریدے ماہنامہ ''نیمروز'' میں شائع ہوئے۔

۵۱۔ بدر عظیم آبادی (م ۱۹۹۹ء)

بدر الدین احمد خاں بدر عظیم آبادی ماضی قریب کے ممتاز شاعر اور سخن ور تھے۔ وہ ۱۹۳۸ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی وفات ۴ مارچ ۱۹۹۹ء کو دہلی میں ہوئی۔ (۸۶)

سیرت سے متعلق ان کی دو انگریزی کتابیں ہمارے دائرہ علم میں آسکی ہیں 300 Authenticated Miracles of Muhammad یہ کتاب ۱۶۲ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کے معجزات کو بیان کیا گیا ہے۔ Prophetic Way of Treatment اس میں نبی کریم ﷺ کی طبی احکامات اور طریقوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ۲۰۵ صفحات پر محیط ہے۔ اس کی ایک طباعت دار الاشاعت کراچی سے ہو چکی ہے۔

۵۲۔ ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی (م ۱۴۲۶ھ)

ڈاکٹر سید عبد اللہ عباس ندوی کا شمار ماضی قریب کے مشہور علما و فضلا میں ہوتا ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۲۵ء میں پھلواری میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مولانا مفتی محمد عباس پھلواروی امارتِ شرعیہ بہار کے صدر مفتی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم پھلواری میں ہوئی۔ مزید تعلیم کے لئے فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا محمد عتیق فرنگی محلی سے استفادہ کیا۔ تکمیلِ علم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے برطانیہ سے فلسفۂ لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں ام القریٰ یونی ورسٹی مکہ مکرمہ میں عربی ادب کا استاد مقرر کیا گیا۔ عالم عرب میں ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ مختلف جامعات میں انہیں محاضرات کے بلایا جانے لگا اور سعودی حکومت نے ان کے اعترافِ علم و فضل میں انہیں سعودیہ کی مستقل شہریت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے متعدد کتابیں تالیف و تصنیف کیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یکم ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ/ یکم جنوری ۲۰۰۶ء کو جدہ (سعودی عرب) میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی نمازِ جنازہ حرم مکی میں امام حرم کی اقتدا میں ادا کی گئی، بعد ازاں انہیں جنت المعلیٰ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ (۸۷)

سیرت سے متعلق ڈاکٹر صاحب نے متعدد لکچرز دیئے اور مضامین لکھے۔ تاہم ان کی کتابوں میں ''پیغمبر اخلاق و انسانیت ارشادات نبوی کی روشنی میں''، ''آفتاب نبوی کی چند روشن کرنیں'' (مطبوعہ مجلس نشریات اسلام کراچی ۲۰۰۲ء) اور ''آداب و فضائل درود و سلام ملحقہ روح کائنات (سیرت النبی ﷺ کے چند عنوانات)'' کا ذکر ملتا ہے۔ جو ہمارے موضوعِ زیرِ بحث سے تعلق رکھتی ہے۔ آخر الذکر کتاب

دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ سے ۲۰۰۵ء میں طبع ہوئی، تعداد صفحات ۱۲۰۔

۵۳۔ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی حفظہ اللہ

ڈاکٹر محمد لقمان سلفی عصر حاضر کے معروف عالم دین، مفسر، محدث اور سیرت نگار ہیں۔ وہ ۱۹۴۱ء کو چندن بارہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ نسباً صدیقی ہیں۔ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے اخذ علم کیا۔ ان کا شمار مفتی اعظم سعودی عرب شیخ ابن باز اور شیخ ناصر الدین البانی کے تلامذۂ خاص میں ہوتا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب سعودی عرب میں مقیم ہیں، اس کے علاوہ ضلع چمپارن (بہار) میں جامعہ امام ابن تیمیہ کے وائس چانسلر بھی ہیں۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں اهتمام المحدثين بنقد الحديث سنداً ومتناً، السنة حجيتها ومكانتها في الاسلام، رش البرد شرح الادب المفرد، مكانة السنة في التشريع الاسلامي وغیرہا شامل ہیں۔ (۸۸) سیرت سے متعلق ان کی ایک نہایت اہم تصنیف ''الصادق الامین'' کا ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خطبات مدراس، سید سلیمان ندوی، مکتبہ خلیل لاہور: ص ۵۳

۲۔ مقدمہ: پیغمبر انسانیت، شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۲۰۰۶ء: ص ۳

۳۔ محاضرات سیرت، ڈاکٹر محمود احمد غازی، الفیصل ناشران کتب لاہور ۲۰۰۷ء: ص ۶۸۰

۴۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک، ڈاکٹر مظفر اقبال، کتاب خانہ پٹنہ ۱۹۸۰ء: ص ۱۹۱، ۱۹۲

۵۔ یاد رفتگاں، سید سلیمان ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۳ء: ج ۱، ص ۲۸۲

۶۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی: ص ۹۴

۷۔ مقدمہ ''پیغمبر انسانیت'': ۲۹ طبع اوّل

۸۔ سیرت النبی ﷺ، علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، شیخ بک ایجنسی لاہور: ج ۱، ص ۲۷۳

۹۔ سیرت النبی ﷺ: ج ۱، ص ۲۷۳

۱۰۔ سیرت النبی ﷺ: ج ۲، ص ۲۸۰، ۲۸۱

۱۱۔ الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ (۸ جلد)، الامام احمد بن علی بن حجر العسقلانی، دار الجیل بیروت ۱۴۱۲ھ: ج ۸، ص ۱۷۵

۱۲۔ محاضرات سیرت: ۶۸۰

۱۳۔ اصح السیر، مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالروف دانا پوری، میر محمد کتب خانہ کراچی: ص ۵

۱۴۔ اصح السیر: ص ۶

۱۵۔ محاضرات سیرت: ص ۶۷۴

۱۶۔ خطبات مدراس: ص ۱۰۷

۱۷۔ دفاع عن الحدیث النبوی ﷺ والسیرۃ، العلامۃ المحدث ناصر الدین الالبانی

۱۸۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی: ص ۹۴

۱۹۔ محاضرات سیرت: ص ۶۸۹

۲۰۔ النبی الخاتم، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مکتبہ اخوت لاہور: ص ۲۲

۲۱۔ مقدمہ پیغمبر انسانیت: ص ۱۱

۲۲۔ پیغمبر انسانیت، شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۲۰۰۶ء: ص ۲۱ طبع اول

۲۳۔ پیغمبر انسانیت: ص ۲۴۷

۲۴۔ پیغمبر انسانیت: ص ۲۴۳، طبع اول

۲۵۔ پیغمبر انسانیت: ص ۲۴۴، طبع اول

۲۶۔ الصادق الامین، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی، الفرقان لاہور ۲۰۰۷ء: ص ۴۰

۲۷۔ مولانا امین اللہ نگرنہسوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی): ج ۱، ص ۱۳۹۔ العلامہ عبدالحیٔ الحسنی۔ نزہۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر۔ طیب اکادمی، ملتان، ۱۹۹۲ء: ج ۷، ص ۹۶، ۹۷۔ ابوالکلام قاسمی شمسی۔ تذکرہ علمائے بہار۔ شعبی نشر و اشاعت، جامعہ اسلامیہ سیتامڑھی، ۱۹۹۵ء: ج ۱، ۲۶، ۲۷۔ محمد تنزیل الصدیقی۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۲۸۔ مولانا فضل حسین بہاری۔ الحیاۃ بعد المماۃ (سوانح عمری سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی)۔ مطبع اکبری، آگرہ ۱۹۰۸ء، ص ۹۳

۲۹۔ مولانا علی سجاد نعمتی پھلواروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر: ج ۷، ص ۲۶۶۔ حکیم محمد شعیب نیر پھلواروی۔ آثارات پھلواری شریف۔ دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری، پٹنہ ۱۹۷۴ء: ص ۲۹۴۔ مولوی حسیب اللہ مختار، مرتبہ سید نعمت اللہ۔ تذکرۃ الصالحین۔ بساط ادب کراچی ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۷، ۱۸۸۔ حکیم سید احمد اللہ ندوی۔ مسلم شعرائے بہار۔ کراچی: ج ۵، ص ۸۴، ۸۵۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۲۶۷، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۳۰۔ مولانا حکیم حسن علی حسن سہرامی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: حکیم محمد اسرار الحق۔ تاریخ اطبائے بہار، پٹنہ۔

جلد اوّل ۱۹۸۰ء، جلد دوم ۱۹۸۴ء: ج ۲، ص ۸۷، ۹۶، تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۷۹، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۳۱۔ تاریخ اطبائے بہار (۲ جلد)، حکیم محمد اسرار الحق، پٹنہ جلد اوّل ۱۹۸۰ء جلد دوم ۱۹۸۴ء: ج ۲، ص ۹۳، ۹۴

۳۲۔ شاہ امیر الحق عمادی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الصالحین: ص ۱۴۳، ۱۴۵۔ نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۸۴۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۳۶، ۳۷۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۳۳۔ شاہ محمد یحیٰ عظیم آبادی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الصالحین: ص ۴۷، ۴۹۔ نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۵۴۹۔ مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ افضل امام۔ دیوان فائز (مجموعۂ کلام شاہ نذیر الحق فائز پھلواروی)۔ دار الادب، پٹنہ، ۱۹۶۴ء: ص ۲۵، ۲۸۔ مسلم شعرائے بہار: ج ۵، ص ۴۳۴، ۴۳۹۔ محمد تنزیل الصدیقی الحسینی۔ اصحاب علم و فضل۔ اصلاح المسلمین پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۵ء: ص ۷۷۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۳۴۔ ڈاکٹر مظفر اقبال۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک۔ کتاب خانہ، پٹنہ، ۱۹۸۰ء: ص ۱۹۰، ۱۹۱

۳۵۔ قاضی سیّد مخدوم عالم پھلواروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الصالحین: ص ۱۸۹، ۱۹۰۔ مسلم شعرائے بہار: ج ۴، ص ۱۴۵، ۱۴۸۔ دیوان فائز: ص ۳۵، ۳۸۔ ماہ نامہ ''ندیم'' (گیا)۔ مئی ۱۹۳۵ء۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۳۶۔ مولانا حکیم ناصر علی غیاث پوری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۵۱۶۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۴۰۲، ۴۰۳۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۳۷۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص ۱۹۱

۳۸۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص ۱۹۱

۳۹۔ مولانا شاہ عطا حسین منعمی گیاوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مسلم شعرائے بہار: ج ۳، ص ۱۸۳، ۱۹۳۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۲، ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۴۰۔ مولانا علی اکرم آروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: فیض الملک الوہاب المتعالی: ص ۸۸۹، ۸۹۱، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۴۱۔ مولانا مرشد حسن کامل کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: آئینۂ ترہت: ۱۰۰، ۱۰۴، مسلم شعرائے بہار: ج ۴، ص ۵۰۔ تاریخ اطبائے بہار: ج ۱، ص ۴۵، ۴۶۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۲۸۱، ۲۸۲، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۴۲۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص ۱۹۱، ۱۹۲

۴۳۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص ۱۹۲

۴۴۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص ۱۹۲

۴۵۔ مولانا حسن بن سلیمان پھلواروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: آثارات پھلواری شریف: ص ۳۷، ۳۷، اصحاب علم و فضل: ۹۸، ۹۹، تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۸۰، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۴۶۔ شمس المعارف۔ مجموعۂ مکاتیب شاہ محمد سلیمان پھلواروی

۴۷۔ شمس المعارف: ص۲۱۴

۴۸۔ مولانا عبد الغفور داناپوری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: اصحاب علم وفضل: ۱۶۶، ۱۷۲، نزہۃ الخواطر: ج۸، ص۲۹۰، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۴۹۔ غایۃ المقصود فی شرح سنن أبی داود، الامام ابوالطیب شمس الحق العظیم آبادی، حدیث اکادمی فیصل آباد ۱۴۱۴ھ: ج۱، ص۶۰

۵۰۔ مولانا الٰہی بخش بڑاکری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: ماہنامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ): جنوری ۱۹۴۸ء ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' (امرتسر): ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء، تاریخ اطبائے بہار: ج۲، ص۲۳۳، ۲۳۴۔ ارباب علم وخرد، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۵۱۔ شاہ محمد توحید زبیری الہاشمی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ۸۴، ۸۹، ۱۲۷، ۱۲۸، اصحاب علم وفضل: ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۷، ۲۰۸، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۵۲۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص۱۹۲

۵۳۔ حفیظ عظیم آبادی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ۱۹۳، ۱۹۴، حفیظ عظیم آبادی، مسلم شعرائے بہار: ج۱، ص۲۶۹، ۲۷۲، شرفا کی نگری: ج۱، ص۲۲۸، ۲۳۱، تذکرہ علمائے بہار: ج۱، ص۴۰۴، الدر المنثور فی تراجم اہل الصادقفور: ص۳۷۲، اصحاب علم وفضل: ص۴۷، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۵۴۔ حفیظ عظیم آبادی:

۵۵۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص۱۹۳، ۱۹۴

۵۶۔ مولانا ابو طاہر بہاری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: اصحاب علم وفضل: ص۲۰۸، دیار ہند کے گمنام اکابر، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۵۷۔ مولانا ابو محمد عبداللہ چھپراوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے حال: ص۵۳، حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ: ص۳۰۶، ۳۰۸، ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور): ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء، براعظم میں اہلِ حدیث خدام قرآن: ص۳۷۰، ۳۷۱، ارباب علم وخرد، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۵۸۔ مولانا شمس الحق کنٹوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۵۹۔ شاہ محمد سلیمان پھلواروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: خاتم سلیمانی، شمس المعارف (مجموعہ مکاتیب شاہ محمد سلیمان پھلواروی)، نزہۃ الخواطر: ج۸، ص۱۸۳، ۱۸۵، آثارات پھلواری شریف: ص۳۶۹، ۳۷۳، شرفا کی نگری: ج۱، ص۲۹۸، ۲۹۹، اصحاب علم وفضل: ص۷۸، ۱۰۳، ماہنامہ ''رفیق'' (پٹنہ) علمائے بہار نمبر: جنوری فروری ۱۹۸۴ء، تذکرہ علمائے بہار: ج۱، ص۱۱۱، ۱۱۲۔ مسلم شعرائے بہار: ج۱، ص۲۳۴، ۲۳۸۔ تاریخ اطبائے

بہار: ج ۱، ص ۱۰، ۱۱۔ یادرفتگاں (ندوی): ص ۱۵۶، ۱۶۲، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۰۔ شفق رضوی عماد پوری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مسلم شعرائے بہار: ص ۲۵۱، ۲۶۰

۶۱۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ص ۱۹۳

۶۲۔ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: یادرفتگاں (ندوی): ص ۳۶۲، ۳۶۵، تاریخ اطبائے بہار: ج ۱، ص ۷۲، ۷۷۔ ماہنامہ ''رفیق'' (پٹنہ) علمائے بہار نمبر: جنوری فروری ۱۹۸۴ء، تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۱۶۴، ۱۶۵، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۳۔ مولانا غلام مصطفےٰ فخر سہسرامی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مسلم شعرائے بہار: ج ۳، ص ۱۹۴، ۱۹۸۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۲۱۸، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۴۔ سیّد عدیل اختر گیاوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: کاروانِ رفتہ: ۲۴۳۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۲، ص ۱۶۹، ۱۷۰۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۵۔ مولانا علی چھپروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ مہدانواں: ص ۴۲، ۴۳۔ تذکرہ علمائے بہار: ص ۱۷۶، ۱۷۷۔ براعظم میں اہلِ حدیث خدام قرآن: ص ۳۹۷۔ علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۶۔ مکاتیب سرمحمد اقبال بہ نام مولانا سید سلیمان ندوی: ص ۱۵، ۱۶، ۳۲، ۹۰

۶۷۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۱۷۷، ۱۸۳۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۱۱۳، ۱۱۴۔ ماہنامہ ''رفیق'' (پٹنہ) علمائے بہار نمبر: جنوری فروری ۱۹۸۴ء۔ سیّد سلیمان ندوی (از ابوعلی اثری)، سیّد سلیمان ندوی (از عبدالرشید عراقی)، یادرفتگاں: ج ۱، ص ۲۷۸، ۲۸۴۔ عظمتِ رفتہ: ص ۳۵۳، ۳۵۸۔ شرفا کی نگری: ج ۲، ص ۲۳۲، ۲۴۰۔ چند رجال اہل حدیث: ص ۹۰، ۹۶۔ پاکستان کرونیکل: ص ۸۸، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۸۔ حافظ محب الحق عظیم آبادی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: شرعۃ الحق: ص ۱۶، ۲۹، بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک: ۱۹۴، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۶۹۔ مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: حیات گیلانی، تذکرہ علماء بہار: ج ۱، ص ۳۱۵، ۳۱۶۔ ماہنامہ ''رفیق'' (پٹنہ) علمائے بہار نمبر: جنوری فروری ۱۹۸۴ء، یادرفتگاں (از ماہر القادری): ج ۲، ص ۳۴۰، ۳۴۴، شرفا کی نگری: ج ۲، ص ۲۴۱، ۲۴۷، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۰۔ مولانا منظور الحق جھومکوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تراجم علمائے اہلِ حدیث: ج ۱، ص ۳۶۸، ۳۷۲، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۱۔ مولانا محمد ایوب شکروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۳۲۱، ۳۲۲، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۲۔ مولوی عبدالغنی غنی عظیم آبادی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مسلم شعرائے بہار: ج ۳، ص ۱۷۹، ۱۸۰، تلامذۂ

شاد: ص ۱۹۸، ۱۹۹، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۳۔ مولانا عبدالصمد رحمانی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۱۸۴، ۱۸۵، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۴۔ پروفیسر محمد مسلم کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: عظیم آباد اور اصناف ادب: ص ۱۴۷، ۱۴۸، تلامذۂ شاد: ص ۲۱۶، ۲۲۲، مجاہدین صادق پور: ص ۲۳۱، ۲۳۹، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۵۔ مولانا عبدالمتین بہاری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے بہار: ج ۲، ص ۱۶۲، ۱۶۳

۷۶۔ مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: آثارات پھلواری شریف: ۳۷۵، ۳۷۶، ماہنامہ ''رفیق'' (پٹنہ) علمائے بہار نمبر: جنوری فروری ۱۹۸۴ء، تذکرہ علماء بہار: ج ۱، ص ۷۵۔ ج ۲، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ بزم ارجمنداں: ص ۳۵۱، ۳۹۹۔ اصحاب علم وفضل: ۱۰۰، علمائے بہار (غیر مطبوعہ)

۷۷۔ مولانا عبیدالرحمان عاقل کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: ماہنامہ ''رفیق'' (پٹنہ) علمائے بہار نمبر: جنوری فروری ۱۹۸۴ء، تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۱۸۹، ۱۹۱

۷۸۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: عظیم آباد اور اصناف ادب: ص ۱۶۹، ۱۷۱۔ مسلم شعرائے بہار: ج ۱، ص ۱۷۸، ۱۸۰۔ وفیات مشاہیر بہار: ص ۴۰

۷۹۔ مولانا نظام الدین پھلواروی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: آثارات پھلواری شریف: ۱۰۴، ۱۰۵، تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۴۰۸

۸۰۔ آثارات پھلواری شریف: ص ۱۰۵

۸۱۔ شاہ محمد قائم قتیل کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے بہار: ج ۱، ص ۳۵۳۔ تذکرۃ الصالحین: ص ۲۱۸، ۲۱۹، عظیم آباد اور اصناف ادب: ص ۱۶۸، ۱۶۹

۸۲۔ مولانا لطف الرحمان ہرسنگھ پوری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علماء بہار: ج ۱، ص ۲۴۱، ۲۴۲

۸۳۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مقالات وملفوظات علامہ سیّد عبدالقدوس ہاشمی: ۷، ۲۳، ۱۶۰، ۱۶۳، تذکرہ علمائے بہار: ج ۲، ص ۱۶۶، ۱۶۷

۸۴۔ مولانا طاہر رسول قادری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: سلسلہ اشرف الانساب: ص ۴۳۳، ۴۳۵

۸۵۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: امّ المومنین سیّدہ ماریہ قبطیہؓ: ص ۱۵، ۱۶۔ اصحاب علم وفضل: ۹۹۔ تذکرہ علمائے بہار: ج ۲، ص ۶۹۔ پاکستان کرونیکل: ۸۱۶۔ کتابی سلسلہ ''جریدہ'' (کراچی) نمبر ۲۷ (۲۰۰۴ء): ۱۰، ۱

۸۶۔ بدر عظیم آبادی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: وفیات مشاہیر بہار: ص ۸۱

۸۷۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے بہار: ج ۲، ص ۱۵۲، ۱۵۳

۸۸۔ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: برا عظم میں اہل حدیث خدام قرآن: ص ۶۰۶، ۶۰۷